BNIS302DET

ہندوستانی مسلم مفکرین

(Indian Muslim Thinkers)

بی۔اے۔(آنرس)

چار سالہ پروگرام

تیسرا سمسٹر (اسلامک اسٹڈیز)

مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ، بھارت

Copyright © 2026, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

ISBN : 978-81-689664-5-1
Course : Indian Muslim Thinkers
First Edition : 2025
Copies : 2000
Price : 105/- (The price of the book is included in admission fee of distance mode students)

Course Coordinator

Dr. Alim Ashraf, Prof. (Arabic), Dept. of Arabic, MANUU

Editorial Board/Editors

Prof. Abdul Ali, Former Head, Dept. of Islamic Studies, AMU, Aligarh

Prof. Mohammad Ishaque
Prof. of Islamic Studies, JMI, New Delhi

Prof. Mohammad Habib, HOD, Dept of Islamic Studies MANUU

Prof. Mohd. Fahim Akhter
Dept. of Islamic Studies, MANUU

Prof. Ghazanfar Ali Khan
Dept. of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU

Prof. Ziauddin
Dept. of Islamic Studies, Aligarh Muslim University, Aligarh

Dr. Mohammad Haziq
Assistant Professor, Islamic Studies, CDOE, MANUU

Dr. Syeda Amina
Assistant Professor (Contractual) Islamic Studies, CDOE, MANUU

Production

Prof. Nikhath Jahan,
Professor (Urdu),
CDOE MANUU

Mr. P Habibulla,
Assistant Registrar, Purchase & Stores Section, MANUU

Dr. Mohd Akmal Khan,
Assistant Professor (C),
CDOE MANUU

Mohd Abdul Naseer,
Section Officer, CDOE MANUU

Shaik Ismail,
UDC, CDOE, MANUU

Syed Faheemuddin, LDC,
Purchase & Stores Section, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:

Centre for Distance and Online Education

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

CRC Prepared by the Dr. Mohammad Haziq, Faculty Islamic Studies, CDOE, MANUU
Printed at: Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

فہرست

پیغام	وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	5
پیغام	ڈائرکٹر، مرکز ابرائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم	6
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر (اسلامک اسٹڈیز)	7

اکائی نمبر	اکائی کا نام	مصنف	صفحہ نمبر
1۔	شاہ ولی اللہ	ڈاکٹر شکیل احمد	9
2۔	عبدالحق محدث دہلوی	ڈاکٹر محمد حاذق	24
3۔	سید احمد رائے بریلوی	ڈاکٹر سیدہ آمنہ	36
4۔	سر سید احمد خاں	محمد عمیر الصدیق ندوی	51
5۔	شبلی نعمانی	ڈاکٹر محمد عبدالباری	69
6۔	محمد اقبال	محمد خالد ندوی	88
7۔	اشرف علی تھانوی	ڈاکٹر محمد سراج الدین	102
8۔	ابوالکلام آزاد	ڈاکٹر مزمل کریم	115
	نمونہ امتحانی پرچہ		130

مصنفین کی تفصیلات

(Writer's Details)

Dr. Shakeel Ahmad, Asst. Prof, Dept. Islamic Studies (Kashmir Campus), MANUU	ڈاکٹر شکیل احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مانو کشمیر کیمپس
Dr. Mohammad Haziq, Asst. Prof, Islamic Studies, CDOE, MANUU	ڈاکٹر محمد حاذق، اسسٹنٹ پروفیسر، سی ڈی اوای، مانو
Dr. Syeda Amina, Asst. Prof. (Cont), CDOE. Islamic Studies MANUU	ڈاکٹر سیدہ آمنہ، اسسٹنٹ پروفیسر، (کانٹریکچول) اسلامک اسٹڈیز، سی ڈی اوای، مانو
Mohd Umairus Siddique Nadvi, Fellow, Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh	محمد عمیر الصدیق، ریسرچ فیلو، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ
Dr. Mohd Abdul Bari, AMU , Aligarh	ڈاکٹر محمد عبد الباری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Mohd Khalid Nadvi, Content Developer, Hyderabad	محمد خالد ندوی، کنٹنٹ ڈیولپر، حیدرآباد
Dr. Mohammad Serajuddin, Asst. prof, Islamic Studies, MANUU	ڈاکٹر محمد سراج الدین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مانو
Dr. Muzammil Karim, Asst. Prof (Temp) Dept. Arabic, Khwaja Moinuddin chisti Language University Lucknow	ڈاکٹر مزمل کریم، اسسٹنٹ پروفیسر (ٹمپروری) شعبہ عربی، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنو

نوٹ: زیر نظر کتاب کا علمی مواد (**Study Material**) مختلف مصنفین نے تیار کیا ہے اور اس سے کو آرڈی نیٹر وایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پروف ریڈرس(Proofreaders):

اول : ڈاکٹر محمد حاذق

دوم : ڈاکٹر سیدہ آمنہ

ٹائٹل پیج(Title Page):

ابراہیم اکرم صدیقی

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی۔ یہ ایک مرکزی جامعہ ہے جس نے این اے اے سی کی جانب سے گریڈ +A حاصل کیا ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے مقاصد ہیں: (1) اردو زبان کا فروغ، (2) پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو اردو میڈیم میں قابل رسائی اور دستیاب بنانا، (3) روایتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم کرنا، اور (4) خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا۔ یہ وہ نکات ہیں جو اس مرکزی جامعہ کو دیگر تمام مرکزی جامعات سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے ایک انفرادیت بخشتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علم کے فروغ کا مقصد یہی ہے کہ اردو جاننے والے طبقے کے لیے عصری علوم اور مضامین تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک طویل عرصے تک اردو میں درسی مواد کی کمی رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے پاس اب اردو میں 350 سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر سمسٹر کے ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اردو یونیورسٹی این ای پی 2020 کے وژن کے مطابق مادری / گھریلو زبان میں تعلیمی مواد فراہم کرنے کے قومی مشن کا حصہ بننے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ مزید یہ کہ اردو بولنے والا طبقہ اردو میں مطالعہ کے مواد کی عدم دستیابی کے سبب نئے اُبھرتے شعبوں اور جدید تر معلومات کے موجودہ میدانوں میں تازہ ترین معلومات و اطلاعات کے حصول سے محروم نہیں رہے گا۔ مذکورہ بالا میدانوں میں مواد کی دستیابی کی بدولت حصولِ معلومات کا نیا شعور بیدار ہوا ہے جو یقیناً اردو داں طبقے کی دانشورانہ ترقی پر اثر انداز ہو گا۔

فاصلاتی اور آن لائن طلبہ کے لیے تعلیم و تدریس کے عمل کو سہل بنانے کے لیے یونیورسٹی کا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) اردو اور متعلقہ مضامین میں خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری کو یقینی بناتا ہے۔

MANUU فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کے لیے SLM بلا معاوضہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مواد اُردو کے ذریعے علم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے برائے نام قیمت پر دستیاب ہے۔ تعلیم تک رسائی کے دائرے کو مزید پھیلانے کے مقصد سے، اردو / ہندی / انگریزی / عربی میں eSLM یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب رکھا گیا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ متعلقہ فیکلٹی کی محنت اور مصنفین کے مکمل تعاون کی بدولت FYUG بی۔اے، بی۔ایس سی اور بی۔کام کی کتابوں کی اشاعت کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کی سہولت کے لیے خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری اور اشاعت کا عمل یونیورسٹی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے خود تعلیمی مواد کے ذریعے اردو جاننے والے ایک بڑے طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے اور اس یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کو پورا کریں گے اور اپنے ملک میں اپنی موجودگی کو جائز ٹھہرا سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ، مانو

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی تعلیم کو دنیا بھر میں ایک نہایت مؤثر اور مفید طریقۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اردو زبان بولنے والے عوام کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے قیام کے وقت سے ہی فاصلاتی تعلیم کا طریقہ متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 1998 میں ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن (نظامتِ فاصلاتی تعلیم) کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور 2004 سے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے، اس کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔

یو جی سی نے ملک میں نظام تعلیم کو مؤثر طور پر منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (ODL) موڈ کے تحت چلنے والے مختلف پروگرام، جو سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) میں چل رہے ہیں، یو جی سی-ڈی ای بی کے منظور شدہ ہیں۔ یو جی سی-ڈی ای بی نے فاصلاتی اور باقاعدہ تعلیم کے نصاب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک دُہرے طرز (ڈوئل موڈ) کی یونیورسٹی ہے جو فاصلاتی اور روایتی دونوں طریقۂ تعلیم کی خدمات فراہم کرتی ہے، اس لیے اپنے مقاصد کو یو جی سی-ڈی ای بی کے رہنما خطوط کے مطابق حاصل کرنے کے لیے اس نے چوائس بیسڈ کریڈٹ سسٹم (CBCS) متعارف کرایا گیا جس کا خود اکتسابی مواد (Self Learning Materials) یو جی سی کے قوانین اور کریڈٹ فریم کے مطابق نئے سرے سے تیار کیے جاچکا ہے۔

سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) کل انیس (19) پروگرام پیش کرتا ہے جن میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ پروگرام شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکنیکی مہارتوں پر مبنی پروگرام بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ سی ڈی او ای نے جولائی 2025 سے این ای پی-2020 کے مطابق چار سالہ یو جی پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے آنرز پروگراموں کو این سی ایف کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو آنرز ڈگری حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سال 2025-2026 سے ایم بی اے پروگرام او ڈی ایل موڈ میں متعارف کرایا گیا ہے۔

مانو نے طلبہ کی سہولت کے لیے نو ریجنل سنٹرز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور چھ سب ریجنل سنٹرز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی) کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑا میں ایک ایکسٹینشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان ریجنل اور سب ریجنل سنٹروں کے تحت ایک سو پچاس سے زیادہ لرنر سپورٹ سنٹر (LSCs) اور بیس پروگرام سنٹر بیک وقت چلائے جارہے ہیں تاکہ طلبہ کو تعلیمی اور انتظامی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام پروگراموں میں صرف آن لائن موڈ کے ذریعے ہی داخلے فراہم کرتا ہے۔

طلبہ کے لیے سیلف لرننگ میٹیریل (SLM) کی سوفٹ کاپی سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب کرائی جاتی ہیں اور آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کے لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو ای۔ میل اور واٹس ایپ گروپ کی سہولت بھی فراہم کی جارہی ہے جن کے ذریعے انہیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس رجسٹریشن، اسائنمنٹ، کاؤنسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کاؤنسلنگ کے علاوہ گزشتہ دو برسوں سے طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے زائد تدارکی (Remedial) آن لائن کاؤنسلنگ بھی فراہم کی جارہی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ آبادی کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مطابق مختلف پروگرامز میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ اس سے اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ کے نظام کو مزید مؤثر اور کارآمد بنانے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، سی ڈی او ای، مانو

کورس کا تعارف

مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے لیے یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی)، ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو (ڈی ای بی) کے 2017 ضابطوں اور دوسرے ترمیمی ضوابط 2018 کے مطابق اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر اردو زبان میں درسی مواد تیار کیا گیا ہے۔ یو جی سی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبہ کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں ایک نظام تعلیم کے طلبہ کے لیے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

موجودہ تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے تحت اسلامک اسٹڈیز کی کتابیں تیار کرائی جارہی ہیں۔ ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے استفادہ کا ذریعہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے چار سالہ (آٹھ سمسٹر) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں یونیورسٹی کو ملک بھر کے ماہرین اسلامک اسٹڈیز، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات حاصل رہیں، اور اس میں اسلامک اسٹڈیز کے تقریباً تمام موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعے تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامک اسٹڈیز کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ امید ہے کہ یہ کتاب طلبہ کے لیے معاون ثابت ہوگی۔

اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف واضافہ اور جدید تحریر کے ساتھ مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی جو دونوں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کرسکے۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق تیار کیا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم بی۔ اے۔ کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کررہے ہیں۔ سمسٹر سوم کے اس دوسرے پرچہ کا عنوان ”ہندوستانی مسلم مفکرین“ ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت بی اے سمسٹر سوم کے لیے ہے۔ اس پرچہ میں کل آٹھ اکائیاں ہیں جن کو دو بلاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں ہندوستان میں معروف مسلم مفکرین کون رہے ہیں؟ ان کے نظریات اور افکار کیا رہے ہیں اور ملک کی تعمیر وترقی میں ان کے کردار سے متعلق تحریری مواد مہیا کیا گیا ہے۔

پروفیسر سید علیم اشرف

کورس کوآرڈی نیٹر

اکائی 1: مشہور مفکر: شاہ ولی اللہ

اکائی کے اجزا:

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 شاہ ولی اللہ دہلوی

1.2.1 حالات زندگی

1.2.2 تدریسی و تصنیفی خدمات

1.3 تجدیدی واصلاحی خدمات

1.3.1 تجدیدی کارنامے

1.4 سماجی اور سیاسی نظریات

1.4.1 سماجی نظریات

1.4.2 سیاسی نظریات

1.4.3 اصلاحی کوششیں

1.5 فرہنگ

1.6 اکتسابی نتائج

1.7 نمونہ امتحانی سوالات

1.7.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1.7.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1.7.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

اسلامی تاریخ میں پوری مسلم دنیامیں بے شمار شخصیات گزری ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں مختلف حیثیتوں سے اسلام کی دعوت و تبلیغ، علوم کی نشر و اشاعت اور ملت اسلامیہ کی دینی، سماجی اور سیاسی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ بر صغیر ہند میں مغلیہ حکومت کے عہد زوال میں مختلف میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی ایسی ہی ایک عظیم شخصیت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔ اس اکائی میں آپ کا تعارف، علمی و تصنیفی خدمات، تجدیدی و اصلاحی کارنامے اور افکار و نظریات بیان کئے جائیں گے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ:

- ہندوستان کی مشہور شخصیت شاہ ولی اللہ دہلوی کے حالات زندگی، ان کی علمی و تصنیفی خدمات اور ان کے تجدیدی و اصلاحی کارناموں سے واقف ہو سکیں۔
- ان کے افکار و خیالات پڑھ کر مختلف حیثیتوں سے صحیح اسلامی تعلیمات سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

1.2 شاہ ولی اللہ دہلوی

1.2.1 حالات زندگی

آپ کا نام ولی اللہ بن عبد الرحیم ہے۔ حالاں کہ والد شاہ عبد الرحیم نے آپ کا نام قطب الدین احمد رکھا تھا اور ولی اللہ بھی نام کا حصہ بنایا تھا البتہ آپ نے ولی اللہ کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کی ولادت 4 شوال المکرم 1114ھ مطابق 21 فروری 1703ء، قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر، یوپی میں ہوئی۔ تاریخی اعتبار سے آپ کا سلسلہ نسب بتیس واسطوں سے خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب سے ملتا ہے۔ شاہ صاحب کے مورث اعلیٰ میں ایک بزرگ شیخ شمس الدین مفتی عہد سلطنت میں ہندوستان تشریف لائے اور ضلع روہتک، صوبہ ہریانہ میں سکونت اختیار کی۔ مفتی شمس الدین نے اس علاقہ میں بدعت و خرافات اور کفر و شرک کے اثرات ختم کر کے صحیح اسلامی عقائد سے لوگوں کو روشناس کرایا اور دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام کیا۔ اس خانوادے سے تعلق رکھنے والے دیگر بزرگوں نے بھی دینی، علمی اور اصلاحی خدمات انجام دیں اور قاضی کا پیشہ اختیار کیا۔ شاہ صاحب کے دادا شیخ وجیہ الدین بڑے عالم اور متقی و پرہیز گار بزرگ تھے۔ آپ کے والد شاہ عبد الرحیم بھی عالم دین اور سلسلہ نقشبندیہ کے صوفی بزرگ تھے۔ انہیں علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں مہارت حاصل تھی اور مختصر مدت کے لئے مغل بادشاہ اورنگ زیب کی تدوین فقہ میں کی جانے والی کوشش میں معاونت بھی کی تھی۔ بعد میں آپ نے دہلی میں مدرسہ رحیمیہ قائم کیا تھا اور اس میں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے مراحل ان کے والد شاہ عبد الرحیم کی نگرانی میں طے ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل کیا گیا اور سات سال کی عمر میں قرآن مجید مکمل کر لیا۔ دس برس کی عمر میں علم نحو کی کتاب شرح جامی پڑھنا شروع کیا۔ اس طرح شاہ صاحب نے پندرہ سال کی عمر تک اس دور کے مروجہ علوم میں دسترس حاصل کر لی جن میں عربی، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ۔ علم کلام، منطق و فلسفہ اور طب شامل تھے۔ شاہ ساحب نے قرأت و تجوید محمد فاضل سندھی سے سیکھی اور علم حدیث کی تعلیم شیخ افضل سیالکوٹی سے حاصل کی۔ حدیث میں مشکوٰۃ شریف، صحیح بخاری، ترمذی شریف اور تفسیر میں مدارک اور بیضاوی کا کچھ حصہ والد صاحب سے بھی پڑھا اور اسی عمر میں سلسلہ نقشبندیہ میں والد شاہ عبد الرحیم سے بیعت ہوئے۔ 1131ھ میں والد صاحب کی وفات کے بعد سترہ سال کی عمر سے مدرسہ رحیمیہ میں مسلسل بارہ سال تک درس دیتے رہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی تیس سال کی عمر میں 1143ھ میں حرمین تشریف لے گئے اور تقریباً چودہ مہینوں تک وہاں قیام فرمایا۔ اس دوران دو مرتبہ فریضہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور حرمین کے علماء، مشائخ اور محدثین سے کسب فیض کیا۔ مدینہ منورہ میں شیخ ابو طاہر مدنی سے حدیث کی کتابیں صحاح ستہ کے علاوہ مؤطا امام مالک، مسند احمد اور جامع کبیر کا درس لیا اور امام شافعی کی کتاب الرسالہ اور قاضی عیاض کی کتاب الشفا کا کچھ حصہ بھی پڑھا۔ اس طرح شیخ ابو طاہر مدنی سے کتب احادیث کی اجازت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ میں شیخ وفد اللہ مالکی سے مؤطا امام مالک اور شیخ تاج الدین سے صحیح البخاری کا درس لیا۔ آپ نے اس کے علاوہ حرمین کے دیگر مشائخ و صوفیاء سے بھی استفادہ کیا اور تمام صوفی سلسلوں کا خرقہ جامیہ بھی عطا ہوا۔ شاہ صاحب حرمین میں جن اساتذہ سے فیضیاب ہوئے ان کے تعارف اور تذکرہ پر مشتمل آپ نے ایک رسالہ انسان العین فی المشائخ الحرمین تصنیف کیا ہے۔

ہندوستان واپسی کے بعد شاہ صاحب دوبارہ مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس میں مصروف ہوگئے۔ بہت جلد آپ کے درس کی شہرت اتنی پھیل گئی کہ دور دراز سے کثیر تعداد میں طلبہ اس میں شامل ہونے کے لئے آنے لگے جس کی وجہ سے مدرسہ کی جگہ تنگ پڑنے لگی۔ اسی وجہ سے بادشاہ محمد شاہ نے شاہجہاں آباد کے کوچہ فولاد خان میں واقع ایک وسیع حویلی کا انتظام کر دیا تاکہ تعلیم و تدریس میں طلبہ کے لئے آسانی ہو۔ لہٰذا آپ نے وہاں درس دینا شروع کر دیا اور بہت جلد یہ مدرسہ ہندوستان میں تشنگان علم کا سبب سے بڑا مرکز بن گیا۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ شاہ صاحب کی وفات تک جاری رہا۔ 29 محرم 1176ھ مطابق 20 اگست 1762ء کو آپ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ اور دہلی کے قبرستان مہدیان میں مدفون ہوئے۔ شاہ صاحب نے دین کی تبلیغ، علوم کی اشاعت اور اصلاح احوال کی جو شمع روشن کی تھی اللہ نے آپ کو ایسے لائق فرزند و جانشین شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر اور شاہ عبد الغنی کی صورت میں عطا فرمائے جنہوں نے اسے روشن رکھا۔

1.2.2 تدریسی و تصنیفی خدمات

تعلیم و تدریس

شاہ ولی اللہ دہلوی کی خدمات کا ایک دائرہ خالص علمی و فکری نوعیت کا ہے جو آج بھی امت مسلمہ کا بیش قیمتی سرمایا ہے۔ آپ نے طویل مدت تک درس و تدریس کے ذریعہ نہ صرف علوم کو فروغ دیا بلکہ علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی جنہوں نے ہندوستان میں علوم کی ترویج واشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ کی تدریسی خدمات کا تذکرہ حالات زندگی میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ والد شاہ عبد لرحیم کی وفات کے بعد ہی سے جو تدریس کا سلسلہ شروع کیا وہ سفر حرمین کے مختصر وقفہ کے علاوہ تا عمر جاری رہا۔ آپ کی تعلیم و تدریس کا طریقہ اس قدر مؤثر و مقبول ہوا کہ طلبہ کی کثرت سے مدرسہ رحیمیہ کا رقبہ ناکافی ہونے لگا تو اس وقت کے حکمراں محمد شاہ نے دوسری وسیع عمارت کا انتظام کیا۔ یہ نئی درس گاہ بعد میں مدرسہ شاہ عبد العزیز کے نام سے مشہور ہوئی۔ شاہ صاحب کا طریقۂ تدریس یہ تھا کہ سب سے پہلے قرآن مجید اور اس سے متعلق علوم پڑھائے جاتے تھے۔۔ اس کے بعد کتب حدیث کا درس شروع کیا جاتا بعد میں فقہ، عقائد اور سلوک کی کتابیں بیک وقت پڑھائی جاتی تھیں۔ تفسیر کے تعلق سے طلبا کے لیے یہ ہدایت تھی کہ وہ ابتدائی مرحلے میں تفسیر نہ پڑھیں بلکہ جب عربی زبان میں مہارت حاصل ہو جائے تو اصل متن قرآن پڑھیں اور خود سے آیتوں کے معنی و مفہوم سمجھیں۔ اس کے بعد جلالین کا مطالعہ کریں کیوں کہ وہ مختصر تفسیر ہے اور آخری مرحلہ میں دیگر تفاسیر کا مطالعہ کریں۔

تصنیف و تالیف

شاہ صاحب نے ایک طرف تعلیم کے پرانے نصاب میں مناسب ترمیم اور اصلاح کر کے اسے نئے سرے سے مدون کیا۔ دوسری جانب تصنیف و تالیف کے ذریعہ اسلامی علوم کے تقریبا تمام میدانوں میں قابل قدر اضافہ کیا۔ تفسیر، علوم قرآن، حدیث ، فقہ، تصوف، حکمت، علم کلام، منطق، فلسفہ، سیرت اور اسلامی تاریخ وغیرہ میں آپ کی دستیاب تصانیف کی تعداد پچاس سے زائد ہیں۔

تفسیر وعلوم قرآن میں "فتح الرحمان فی ترجمة القرآن" کے نام سے فارسی زبان میں ترجمہ قرآن ہے اور فتح الخیر عربی زبان میں قرآن مجید کی مختصر تفسیر ہے۔ اسی طرح الفوز الکبیر اور مقدمه فی قوانین الترجمه کے ذریعہ فارسی زبان میں تفسیر و ترجمہ کے اصول بیان کئے ہیں۔ علم حدیث میں تراجم ابواب البخاری اور شرح تراجم ابواب البخاری دو رسالے حدیث کی مشہور کتاب بخاری شریف کے تراجم اور عنوانات احادیث کی حکمت پر ہیں اور مؤطا امام مالک کی دو شرحیں فارسی میں المصفی اور عربی میں المسوی ہیں۔ الاربعین چالیس احادیث کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ علم حدیث پر عربی میں دو رسالے فضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین اور النوادر من احادیث سید الاوائل و الآخر ہیں۔ فقہ میں عقد الجید فی الاحکام الاجتہاد و التقلید اور غایة الانصاف فی بیان سبب الاختلاف میں عربی زبان میں اجتہاد ، تقلید اور عدم تقلید کے مسائل بیان کئے گئے ہیں ۔ ہمعات، سطعات، القول الجمیل اور الخیر الکثیر تصوف و سلوک سے متعلق موضوعات پر مشتمل ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ عربی میں عبادات و معاملات کی حکمتوں اور مصلحتوں سے متعلق شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ شریعت کے اسرار و موز کے موضوع پر التفہیمات الا لٰہیہ اور البدور البازغہ بھی ہیں۔ فیوض الحرمین عربی میں قیام حرمین کے دوران شاہ صاحب پر جو بشارتیں ہوئیں اس سے متعلق ہے۔ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء عربی میں

انبیاء کرام کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اسلامی تاریخ میں ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور قرۃ العین فی تفضیل الشیخین فارسی زبان میں خلافت کے منصب، خلفائے راشدین کی خلافت اور ان کے خصائص کی تفصیلات پر مبنی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی شاہ صاحب کی بہت سی تصانیف ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے امت کی علمی و فکری رہنمائی کی۔

1.3 تجدیدی واصلاحی خدمات

1.3.1 تجدیدی کارنامے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایک ایسے مجدد ہیں جس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ جب ہندوستان میں مسلمان دینی، سیاسی، سماجی اور علمی و فکری اعتبار سے پسماندگی کا شکار تھے۔ اور اسلامی تعلیمات سے دور شرک و بدعت اور خرافات میں مبتلا تھے۔ اس وقت شاہ صاحب نے دین کی تجدید، امت کی اصلاح اور اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کا کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ آپ کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور مختلف میدانوں میں پھیلا ہوا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے تاریخ دعوت و عزیمت میں لکھا ہے کہ اگر شاہ ولی اللہ دہلوی کی تجدیدی اور اصلاحی کوششوں کو الگ الگ بیان کیا جائے تو ان کے حسب ذیل عنوانات ہو سکتے ہیں:

1. عقائد کی اصلاح اور دعوت قرآن۔
2. حدیث و سنت کی اشاعت و ترویج اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی دعوت و سعی۔
3. شریعت اسلامی کی مربوط اور مدلل ترجمانی اور اسرار و مقاصد حدیث و سنت کی وضاحت۔
4. اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح، خلافت راشدہ کے خصائص اور اس کا اثبات۔
5. سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور انحطاط میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ و قائدانہ کردار۔
6. امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو اصلاح و تبدیلی کی دعوت۔
7. علماء، راسخین اور مردان کار کی تعلیم و تربیت جو ان کے بعد اصلاح امت اور اشاعت دین کا کام جاری رکھیں۔

شاہ صاحب کی ان جملہ مساعی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ تجدیدی ہے یعنی دین کے مختلف شعبوں میں امت کی صحیح رہنمائی اور دوسرا حصہ اصلاحی ہے یعنی مسلمانوں کے مختلف طبقات کی دینی، سماجی اور سیاسی اصلاح۔ ذیل میں ان دونوں میدانوں میں آپ کی خدمات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

1. علوم القرآن

شاہ ولی اللہ دہلوی کہتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جو مختلف طریقوں سے رسولؐ پر نازل ہوا اور آپؐ نے الٰہی ہدایت کے مطابق آیتوں اور سورتوں کو ترتیب دیا۔ تمام آیتیں اور سورتیں آپس میں مربوط ہیں اور ان کے درمیان ایک نظم ہے۔ شاہ صاحب مزید کہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ اور معنی دونوں الہامی ہیں جو جدا نہیں ہو سکتے۔ قرآن کی ان آیتوں کا معنی و مفہوم عربی جاننے والے باسانی سے

سمجھ لیتے تھے مثلاً جب نازل شدہ آیات نبیؐ صحابہ کرام کے سامنے تلاوت کرتے تھے تو وہ اس کے معنی، شان نزول اور مقصد کو سمجھ جاتے تھے حتی کہ کفار مکہ بھی اہل ایمان کی طرح اس معنی و مفہوم کو سمجھتے تھے وہ محض اپنی ضد میں اس سے روگردانی کرتے تھے۔ آپ کا یہ بھی کہنا ہے کہ نزول قرآن کا اصلی مقصد انسان کی ذہنی اور روحانی تربیت کرکے اسے انسان کے لیے مفید بنانا ہے اور قرآن کا انداز بیان اور فصاحت وبلاغت بے مثال ہے جس نے عربوں کو بے حد متاثر کیا۔ قرآن مجید دائمی ہے اس میں ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ صرف پانچ آیات نزول قرآن کے وقت منسوخ ہوئیں۔ قرآن اپنے نزول کے وقت جس طرح تمام علم کا منبع اور ہدایت کا مرکز تھا اسی طرح قیامت تک رہے گا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کا اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی اشاعت اور دعوت قرآن کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے دائمی سرچشمہ قرآن کریم سے امت کے رشتہ کو مضبوط کیا اور اسے ایک مخصوص علمی حلقہ سے نکال کر عام لوگوں تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی۔ کیونکہ عام طور پر لوگوں کا مزاج یہ تھا کہ قرآن کو سمجھنا اور اس پر غور و فکر کرنا صرف علماء کا کام ہے اور عوام کے لئے محض اس کی تلاوت کافی ہے۔ حتی کہ علمی حلقوں میں بھی قرآن فہمی کا تصور مفقود تھا۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے اس وقت کی رائج عوامی زبان فارسی میں فتح الرحمٰن فی ترجمة القرآن کے نام سے قرآن مجید کا سلیس ترجمہ کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کی لوگ براہ راست قرآن مجید سے فائدہ اٹھائیں اور جو عربی نہ جانتے ہوں وہ بھی ترجمہ کی مدد سے قرآن کو سمجھ کر اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ اس مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی بھلائی کا تقاضہ ہے کہ قرآن مجید کا روزمرہ کی سلیس فارسی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ جو تکلف و تصنع سے آزاد اور متعلقہ قصوں اور مختلف النوع توجیہات سے مبرا ہو۔ تاکہ خاص و عام اس سے فائدہ اٹھائیں اور چھوٹے بڑے سب اس سے یکساں طور پر مستفید ہوں۔"

شاہ صاحب کے بعد آپ کے لائق فرزندوں میں شاہ عبد العزیز نے فتح العزیز کے نام سے فارسی میں قرآن مجید کے چند پاروں کی تفسیر لکھی۔ اس کے بعد دوسرے فرزند شاہ عبد القادر نے موضع القرآن کے نام سے مکمل قرآن کی تفسیر تحریر کی اور تیسرے فرزند شاہ رفیع الدین نے قرآن کریم کا اردو زبان میں لفظی ترجمہ کیا۔ گویا کہ شاہ صاحب کا ترجمہ قرآن برصغیر ہند میں فہم قرآن کی تحریک کے لئے ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ آپ کے فرزندوں کے علاوہ بعد کے ادوار میں علماء کرام نے مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی بے شمار خدمات انجام دیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

2. علم حدیث

شاہ ولی اللہ محدث کا کہنا ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں کتابت حدیث کا کام نہیں ہوا بلکہ حدیث کی جمع و تدوین کا کام پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا جو دوسری صدی ہجری میں پائے تکمیل کو پہنچا اور حدیث کی پہلی بنیادی کتاب موطا امام مالک بن انس ہے۔ صحائے ستہ اور دوسری حدیث کی صحیح کتابیں بعد میں اسی کو بنیاد بنا کر ترتیب دی گئیں۔ اس لیے شاہ صاحب کے نزدیک موطا امام مالک دوسری کتب

احادیث کے مقابلے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ آپ نے حدیث کی تمام کتابوں کو صحت کے اعتبار سے پانچ طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں موطا کو بنیادی کام بتایا ہے اور صحیح بخاری و صحیح مسلم کو طبقہ اول میں رکھا ہے۔ جامع ترمذی، سنن ابوداؤد اور سنن نسائی کو اس کے بعد کے درجے میں جگہ دی ہے۔ اس طرح شاہ صاحب نے صحیح وضعیف احادیث کے درمیان بھی فرق کیا ہے اور ان محدثین پر کلام کیا ہے جنہوں نے حدیث کی صحت کو جانچنے کے اصولوں پر عمل نہیں کیا ہے اس تعلق سے آپ نے بخاری شریف کو اہمیت دی ہے کیوں کہ امام بخاری نے حدیث کی صحت کے ضابطوں پر سختی سے عمل کیا ہے۔

علم حدیث میں شاہ صاحب کا گرانقدر کام حدیث نبوی کی وسیع ترویج واشاعت بھی ہے۔ آپ حدیث کو دین اسلام کی اساس تصور کرتے تھے کیوں کہ قرآن کریم کے بعد شریعت اسلامی کا دوسرا سب سے بڑا ماخذ حدیث نبوی ہے۔ جس طرح شاہ صاحب نے ترجمہ قرآن کے ذریعہ عام لوگوں کے لئے قرآن مجید سے براہِ راست استفادہ کو آسان بنایا۔ اسی طرح وہ علم حدیث کو بھی صرف علماء تک محدود رکھنے کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ عوام الناس کو حدیث کے علم سے واقف کرانے کے لئے موطا امام مالک کی عربی شرح مسویٰ کے علاوہ اس کا فارسی ترجمہ و شرح مصفیٰ کے نام سے بھی تحریر فرمایا۔ ہندوستان خاص کر شمالی ہند میں حدیث اور سنت نبوی کی تبلیغ واشاعت میں عبد الحق محدث دہلوی کے بعد شاہ صاحب کی جملہ مساعی سب سے نمایاں ہیں۔ آپ کے صاحب زادے شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں کہ "علم حدیث مدینہ منورہ سے والد ماجد لائے"۔ شاہ صاحب نے حرمین میں اپنے قیام کے دوران علم حدیث میں کامل مہارت کے بعد جب ہندوستان واپس آئے تو تدریس و تصنیف کے ذریعہ علم حدیث کے فروغ واشاعت میں اس قدر دلچسپی لی کہ محدث آپ کے نام کا جز بن گیا۔

علم حدیث کی نشر واشاعت کے متعلق شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"علوم یقینیہ میں سے قابل اعتماد اور تمام دینی فنون کی اساس اور اصل علم حدیث ہے۔ جس میں سید المرسلین ﷺ و آلہ و اصحابہ اجمعین کے قول یا فعل یا تقریر کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ احادیث تاریکی میں روشن چراغ، ہدایت کے سنگ میل اور بدر کامل کی طرح ہیں۔ جس نے ان احادیث کا اتباع کیا اور انہیں سیکھا اسے رشد و ہدایت نصیب ہوئی اور اسے خیر کثیر عطا کیا گیا اور جس نے اعراض و روگردانی کی وہ گمراہی و ہلاکت میں پڑا اور اسے نقصان کے سوا کچھ نہ ملا"۔

3. فقہ

فقہ کا بنیادی ماخذ شاہ ولی اللہ کے نزدیک قرآن مجید ہے اور چوں کہ حدیث قرآن کا عملی نمونہ ہے اس لیے یہ دوسرا بنیادی ماخذ ہے بعد میں دو مزید ماخذ اجماع اور قیاس کا اضافہ بھی اس لیے ہوا کہ یہ دونوں بھی قرآن سے ثابت ہیں اور قرآن و حدیث کے درمیان آپسی ربط و تعلق کے بغیر فقہ ممکن نہیں ہے۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ اسلام کے شروعاتی دور میں فقہی مسائل اور ان کے حل کو باقاعدہ ضبط تحریر میں لانے کا رواج نہیں تھا۔ یہ طریقہ سب سے پہلے مالک بن انس نے موطا میں شروع کیا اور اس طرح انہوں نے فقہی طریقے کی بنیاد رکھی گویا فقہی مسلک کا اصل مصدر موطا ہے جو چاروں فقہی مسالک کی بنیاد ہے۔ اور ان چاروں مسالک کے درمیان جو فروعی اختلافات ہیں اس کی وجہ دراصل فقہاء کا مقصد بہتر سے بہتر متبادل پیش کرنا تھا۔ چاروں فقہی مسلک درست ہیں اور لوگ ان میں سے کسی بھی مسلک کی پیروی کر سکتے

ہیں۔

شاہ صاحب کی ایک تعمیری کوشش یہ بھی ہے کہ انہوں نے فقہی اختلافات اور مسلکی تعصب کے درمیان ایک ایسی اتحاد اور اعتدال کی راہ نکالنے کی کوشش کی جو شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ آپ نے فقہی مسائل میں قرآن و سنت کو شریعت کا اصل مصدر قرار دیا۔ ہندوستان میں ترکی اور افغانی مسلم حکمرانوں کے زیر اثر ابتدا ہی سے فقہ حنفی کو غلبہ حاصل رہا۔ اس لیے نہ مذاہب اربعہ کے تقابلی مطالعہ کا رجحان پیدا ہوا اور نہ ہی باہمی ہم آہنگی کا مزاج پروان چڑھ سکا بلکہ آپسی اختلافات کی خلیج بڑھتی گئی۔ شاہ صاحب کو چونکہ حرمین میں شافعی اور مالکی علماء و مشائخ سے استفادہ کا موقع ملا لہٰذا ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی۔ اسلئے گرچہ وہ خود فقہ حنفی کی پیروی کرتے تھے لیکن دوسرے مسالک کو غلط نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ابتدائی زمانہ میں جب باقاعدہ فقہی مذاہب کی تشکیل نہیں ہوئی تھی تو لوگ کسی ایک مسلک کے پابند نہیں تھے، بلکہ جس فقیہ سے چاہتے مسئلہ کا حل معلوم کر کے اس پر عمل کرتے تھے۔ لیکن جب بعد میں یہ فقہی مسالک وجود میں آگئے تو لوگ کسی ایک امام کے مسلک کی پیروی کرنے لگے اور دوسرے اماموں کی رائے سے ان کو کوئی واسطہ نہ رہا بلکہ آپسی اختلافات شروع ہو گئے۔ شاہ صاحب کا کہنا تھا کہ برصغیر ہند میں چوں کہ حنفی اور شافعی مسلک کے ماننے والے زیادہ ہیں اس لیے علماء کو چاہیے کہ جو مختلف فیہ مسائل ہیں ان کے درمیان اتحاد و اعتدال کی راہ پیدا کریں اور اس کے لیے موطا امام مالک کو بنیاد بنائیں کیوں کہ ان دونوں مسالک کی اصل وہی ہے۔ اور جو چیزیں قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں ان میں رائے کا استعمال نہ کریں اور جو دائمی احکامات ہیں انہیں بھی مشروط اور مخصوص نہ کریں۔ آپ نے ہر زمانہ میں پیش آنے والے مسائل کے حل کے لئے بنیادی شرطوں کے ساتھ اجتہاد کو جاری رکھنے پر زور دیا۔ وہ عوام الناس کو تقلید سے نہیں روکتے لیکن اہل علم کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ اجتہاد کرتے رہیں۔

4. تصوف

قرآن اور حدیث میں تزکیہ اور احسان کا ذکر ہے انہیں اختیار کرنے والے صوفی اور سالک کہلاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کا کہنا ہے کہ احسان، تزکیہ اور عرفان خداوندی کے لیے صوفیا کے یہاں جو طریقے رائج ہیں وہ نبیؐ کی سنت، صحابہ کے عمل اور اسلاف کے یہاں ملتے ہیں۔ اس لیے شریعت اور طریقت ایک دوسرے سے الگ نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے جسم اور روح کی طرح باہم مربوط ہے۔ البتہ تصوف کی اصطلاحات مثلاً بیعت، خرقہ اور ارشاد وغیرہ یہاں تک کہ لفظ تصوف اور صوفی دوسری صدی ہجری میں استعمال ہوئیں۔ شاہ صاحب کا نظریہ ہے کہ انسان کی اندر اچھائی اور برائی دونوں کیفیات کام کرتی ہیں اور ہر ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صوفیا کا ماننا ہے کہ انسان کو تین خصوصیات عطا ہوئی ہیں دل، دماغ اور روح شاہ صاحب نے اس میں چوتھی خصوصیت جبلت کو بھی شامل کیا ہے اور انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ ان چاروں کو قابو میں رکھے اور انہیں حیوانی خصلت سے بچائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد سے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے۔ جنہوں نے انسان کی ان فطری خصلتوں کا تزکیہ کیا اور ان کی تربیت کرنے میں مدد کی۔ لہٰذا انسان کو پیغمبرانہ تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔

شاہ صاحب کے صوفیانہ نظریات میں ابن العربی کے نظریہ وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندی کے نظریہ وحدت الشہود دونوں

کے اثرات نمایاں ہیں۔ شاہ صاحب کا ماننا ہے کہ وحدت الشہود دراصل وحدت الوجود کا اگلا مرحلہ ہے کیوں کہ جب ہم وحدت الوجود کا تصور کرتے ہیں تو وحدت الشہود اس میں خود بخود شامل ہوتا ہے۔ اس لیے ان دونوں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ شاہ صاحب کا خاندانی طور پر صوفی سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق تھا حالاں کہ وہ دیگر صوفی سلاسل سے بھی بیعت تھے۔ آپ کا خیال ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ میں توحید کا واضح اور سادہ تصور موجود ہے اور دوسرے سلسلوں کی طرح بعض رسم و رواج مثلاً فاتحہ خوانی، عرس اور زیارت قبور وغیرہ کا رواج کم ہے حالاں کہ شاہ صاحب ان چیزوں کے مخالف نہیں ہیں۔ بس ان کا کہنا یہ ہے کہ صوفی طریقے قرآن و سنت اور شریعت کے مطابق ہونے چاہیے اس لیے وہ صوفیا کے لیے قرآن و سنت اور شریعت کا علم لازمی قرار دیتے ہیں۔

5. شرعی حکمتوں کی تفہیم

شاہ ولی اللہ دہلوی کا ایک عظیم الشان علمی کارنامہ شرعی احکامات کی حکمتوں، مصلحتوں اور مقاصد شریعت کی تفہیم ہے۔ حالانکہ آپ سے پہلے بھی شرعی احکامات کے مصالح و مقاصد پر مفکرین اسلام امام غزالی، امام شاطبی اور شیخ عزالدین وغیرہ نے نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ شاہ صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اس وقت ہندوستان میں رائج منطق و فلسفہ کی لایعنی بحثوں میں پڑنے کے بجائے اسلامی عقائد و عبادات، اخلاقیات و سماجیات اور سیاست و معیشت کی حکمتوں اور مصلحتوں پر عقلی اور فلسفیانہ انداز میں گفتگو کر کے فلسفہ حیات کے اسلامی تصور کو پیش کیا۔ اس موضوع پر شاہ صاحب کی بے مثال تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ اس میں دینی و دنیوی تمام اہم مباحث میں شریعت کے اسرار و رموز پر اس کی کلیات سے جزئیات تک پر نہایت مدلل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ نزہۃ الخواطر کے مصنف حجۃ البالغۃ کے متعلق لکھتے ہیں:

"شاہ صاحب پر اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے میں ایسا نور ڈالا جس سے شریعت کے اسرار ان پر کھل گئے۔ پھر ان کا سینہ ان اسرار کے بیان کے لئے کھول دیا چنانچہ آپ نے انہیں بہترین انداز میں حجۃ اللہ البالغہ میں بیان کیا۔"

6. سیرت و اسلامی تاریخ

شاہ ولی اللہ نے نبوت و رسالت کے بنیادی مقاصد پر منطقی دلائل سے بحث کی ہے۔ اور مختلف تحریروں میں سیرت نبوی کے موضوع کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے سیرت طیبہ کو بیان کرنے کے لیے احادیث کو بنیادی ماخذ بنایا ہے اور مورخین کے طرز پر آپؐ کی سوانح عمری اور اہم واقعات کا محض تذکرہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان واقعات کے اسباب و نتائج اور پس منظر پر بھی گفتگو کی ہے۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ خلافت راشدہ دراصل مقصد نبوت کی توسیع صورت تھی تاکہ آپؐ کے بعد کار نبوت جاری رہ سکے۔ جیسا کہ بعد میں اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو وسعت ملی۔ اسی وجہ سے آپؐ نے غزوہ خیبر کے بعد ہی خلافت کا تصور پیش کر دیا تھا۔ شاہ صاحب خلافت پر بات کرتے ہوئے منصب خلافت کی اہمیت و ضرورت، اس کی خصوصیات اور خلفائے راشدین کے متعلق اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔

1.4 سماجی اور سیاسی نظریات

1.4.1 سماجی نظریات

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں سماج کے اسلامی تصور اور معاشرتی زندگی کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ تاکہ ایک صحت مند اسلامی معاشرہ وجود میں آسکے اور شریعت اسلامی کے اجتماعی معاشرتی و تمدنی فوائد سے عملی طور پر لوگ مستفید ہو سکیں۔ اس تعلق سے شاہ صاحب نے معاشرہ کے ارتقائی مراحل بیان کئے ہیں جس کے لیے "ارتفاقات" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا معنیٰ ہوتا ہے فائدہ اٹھانا۔ حالاں کہ سماج کے ارتقا کا یہ نظریہ اس سے پہلے سماجیات کے بانی ابن خلدون نے پیش کیا تھا جسے مزید بہتر اور منطقی طور پر شاہ صاحب نے بیان کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ بقائے نسل اور تحفظ جان یہ دونوں خصوصیات انسان اور حیوان میں مشترک ہوتی ہیں اور انہیں دونوں ضرورتوں کے پیش نظر انسان حیوانات کے مقابلے میں اجتماعیت کا زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ انسان اشتراک عمل اور آپسی تعاون کے ذریعہ چار تدریجی مراحل سے گزر کر متمدن اور مہذب بنتا ہے۔ ارتفاق اول میں ایک بدویانہ زندگی گزارنے والا سماج تشکیل پاتا ہے۔ ارتفاق دوم میں انسان بدویانہ زندگی سے نکل کر مہذب شہری زندگی کی طرف آگے بڑھتا ہے اور زندگی گزارنے کے آداب اور ضوابط کو اختیار کرتا ہے۔ تیسرا ارتفاق انسانی سماج کی ترقی یافتہ شکل ہے جس میں ایک منظم ریاست قائم ہو جاتی ہے۔ ارتفاق چہارم میں ریاست کے نظام کو چلانے اور اس کے مختلف شعبوں کو باہم متحد رکھنے کے لئے ایک حاکم اعلیٰ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کے درمیان باہمی اشتراک کا عمل بحسن وخوبی جاری رہ سکے۔ اسی حاکم اعلیٰ کو شاہ صاحب امام یا خلیفہ کا نام دیتے ہیں۔

1.4.2 سیاسی نظریات

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی تصانیف ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اورقرۃ العین فی تفضیل الشیخین میں خلافت راشدہ کا مقام اور خلفائے راشدین کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ خلیفہ ایک باعزت خاندان سے ہونا چاہیے تاکہ عوام اس کی اتباع کریں۔ اور حکمراں کو اسلام کی اشاعت، دفع اور جہاد کا جذبہ، شریعت و قانون کے نفاذ کی طاقت، احکامات جاری کرنے کی صلاحیت، اولوالعزمی، ذہانت اور دوراندیشی جیسی خوبیوں سے متصف ہونا چاہیے۔ سیاست کے میدان میں آپ کے وہ عملی اقدامات بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جو آپ نے مغلیہ حکومت کی زوال پذیر سلطنت کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے اٹھائے تھے۔ انہوں نے ایک طرف حکمرانوں، وزیروں اور امراء کو خطوط لکھ کر ان کی کوتاہیوں، عیش پسندیوں اور غلط کاریوں کے انجام سے خبردار کیا اور دوسری جانب حکومت کے استحکام کے لئے نہایت مفید سیاسی و انتظامی مشورے دیئے۔

1.4.3 اصلاحی کوششیں

تصوف کی اصلاح

شاہ ولی اللہ دہلوی نے ایک طرف تصوف و سلوک کے فوائد و برکات سے مستفید ہونے کے لئے لوگوں کو تصوف و احسان کے صحیح

تصور اور اس کی روح سے روشناس کرایا۔ دوسری طرف تصوف کے نام پر رائج بدعت و خرافات اور غیر اسلامی طریقۂ کار پر سخت تنقید کی اور عوام کو ان کی خرابیوں سے دور رہنے کی تلقین کی۔ حالاں کہ شاہ صاحب صحیح تصوف کے مخالف نہیں تھے بلکہ خود نقشبندیہ سلسلے سے بیعت تھے اور تصوف کے دیگر جملہ سلاسل سے استفادہ کے قائل تھے۔ البتہ ان کا کہنا تھا کہ صوفیا کی اندھی تقلید نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اہل تصوف کے اقوال و احوال کو شریعت کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ یقیناً تزکیہ و احسان شریعت کی اطاعت کا ایک اہم جزء ہیں لیکن تصوف کے مقابلے میں شریعت کو اولیت حاصل ہے۔ اسلئے شعبدہ بازیوں اور کشف و کرامات کے چکر میں پڑنے کے بجائے قرآن و سنت کے مطابق شریعت مطہرہ کا سیدھا اور آسان راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

بدعت و خرافات کا خاتمہ

شاہ صاحب کے عہد میں بدعات اور بری رسموں کا دور دورہ تھا۔ ہر خاص و عام شریعت اسلامی کی اصل تعلیمات سے دور الحاد و بے دینی اور مذہبی گمراہی میں مبتلا تھا۔ علماء نے دنیاوی فائدوں کے حصول کے لئے بدعات و خرافات کی تبلیغ و تشہیر کر کے مسلمانوں کو کتاب و سنت سے دور کر دیا تھا۔ شاہ صاحب نے نہایت جرأت و حوصلہ مندی سے ان گمراہیوں پر تنقید کی اور ان کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں تفہیمات الالٰہیہ میں فرماتے ہیں:

"میں بخدا یہ کہتا ہوں کہ ہمارے زمانے کے گمراہ اور گمراہ کن متصوفین کا گروہ اسلام میں خود رو گروہ ہے۔ اصل اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بدعات ایسے امور ہیں جنہیں لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے بعد تحریف کر ڈالا اور انہیں کار ثواب سمجھ لیا یا ان کے عادی ہو گئے۔"

اسی طرح آپ نے یوم عاشورہ، شب برات، قبر پرستی اور معاشرہ میں رائج دوسری بری رسموں سے مسلمانوں کو بچنے کی تلقین کی۔

مختلف طبقات کی اصلاح

شاہ ولی اللہ دہلوی نے مسلمانوں کے انحطاط، حکومت کے زوال اور معاشرہ کے بگاڑ کے لئے سلاطین، امراء، فوجیوں، علماء، مشائخ، صوفیاء، واعظوں، صنعت کاروں اور عام مسلمانوں یعنی سبھی طبقوں کو ذمہ دار ٹھرایا اور ان میں سے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ خطاب کر کے انہیں ان کی کوتاہیوں اور برائیوں سے آگاہ کیا اور ان سے باز آنے کی نصیحت کی۔ سلاطین سے خطاب کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا:

"اے بادشاہو! اس زمانے میں ملاء اعلیٰ کی رضامندی یہ چاہے گی کی تم لوگوں کی منزلی اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو، ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ اور ایسا کر دو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو۔ اس کے بعد لوگ امن و امان کی صحیح مسرت سے فائز المرام ہو سکتے ہیں۔"

امراء و ارکان سلطنت کے نام ان کا پیغام تھا:

"اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ تم دنیا کی فانی لذتوں میں ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد

ہوئی ہے، ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تا کہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جب قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔"

فوجی سپاہیوں سے انہوں نے کہا:

"اے فوجیوں اور عسکریو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا، مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہو گی اور خدا کا حکم بلند ہو گا اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے۔ لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے اسے تم چھوڑ بیٹھے۔"

اہل صنعت و حرفت کو انہوں نے ہدایت کی:

"ارباب پیشہ! دیکھو! امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے۔ حالاں کہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے قسم قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں جو تمہاری اور تمہارے متعلقین کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن تم نے خدا کی ناشکری کی اور حصول رزق کی غلط راہ اختیار کی۔ کیا تم جہنم کی عذاب سے نہیں ڈرتے جو بڑا برا بچھونا ہے۔"

غلط کار علماء کو شاہ صاحب نے ہدایت کی:

"ارے بد عقلو! جنہوں نے اپنا نام علماء رکھ چھوڑا ہے، تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو اور صرف و معانی و نحو میں غرق ہو اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔"

واعظو اور زاہدوں کو انہوں نے یاد دلایا:

"اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم اس لئے پیدا ہوئے تھے کہ لوگوں کو آسانیاں بہم پہنچاؤ گے نہ کہ ان کو دشواریوں میں مبتلا کرو گے۔"

غرض یہ کہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے سبھی طبقات کو خطاب کر کے فرداً فرداً ہر ایک کو ان کی کمیوں، کوتاہیوں اور خرابیوں سے آگاہ کیا اور ان کے امراض کی تخصیص کر کے علاج کا نسخہ تجویز کیا۔ اس طرح آپ نے بحیثیت مجدد و مصلح اصلاح معاشرہ کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا۔

1.5 فرہنگ

مفقود : غائب، ندارد، ناپید

مشترک : شریک کیا گیا، ایسی چیز جس میں دو یا اس سے زیادہ شریک ہوں

شعبدہ باز : کرتب دکھانے والا

فائز المرام : مقصود و مراد پانے والا، بامراد، جس کا مقصد حاصل ہو گیا ہو

تخصیص : خصوصیت، خاص کرنا

1.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بر صغیر ہند میں علوم کی ترویج و اشاعت اور مختلف میدانوں میں تجدیدی اور اصلاحی خدمات انجام دیں اس وجہ سے انہیں مجدد شمار کیا جاتا ہے۔
- آپ نے قرآن مجید کے تعلق سے بنیادی چیزوں کی وضاحت کی اور امت کو رجوع الی القرآن کی دعوت دی اور اس مقصد سے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ تاکہ لوگوں کے اندر قرآن فہمی کا شعور پیدا ہو اور عوام و خواص سب یکساں طور پر کتاب اللہ سے مستفید ہو سکیں۔
- شاہ صاحب نے علم حدیث کی ترویج و اشاعت میں اس قدر گراں قدر خدمات انجام دیں کہ محدث ان کے نام کا جزو بن گیا۔ اس سلسلے میں تعلیم و تدریس کے علاوہ قیمتی علمی سرمایہ تصنیف کیا۔ اور آپ نے حدیث کی جمع و تدوین کی تاریخ بتاتے ہوئے احادیث کی کتابوں کی صحت کے اعتبار سے درجہ بندی بھی کی۔ اس میں موطا امام مالک بن انس کو اول درجہ میں رکھا ہے۔
- آپ نے فقہ کی وضاحت کی اور فقہی مسائل میں آپسی اختلافات اور تعصب کے درمیان ایک اعتدال کی راہ نکالی اور اس میں ایسی تطبیق پیدا کی جو شریعت کے مزاج کے مطابق ہے۔ انہوں نے عام لوگوں کے لیے تقلید کو ضروری قرار دیتے ہوئے مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ اجتہاد کو جاری رکھنے پر زور دیا۔
- شاہ صاحب نے شریعت کے اسرار و رموز اور شرعی احکامات کی حکمتوں اور مصلحتوں کی وضاحت کی۔ اس تعلق سے انہوں نے اسلامی عقائد، عبادات اور اخلاقیات وغیرہ کی حکمت و مصلحت مدلل انداز میں بیان کی ہے۔
- آپ نے اسلام کے سیاسی و معاشرتی نظام کی تشریح و تعبیر کی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سماجی اور سیاسی مسائل کا حل پیش کیا۔
- آپ نے ہندوستان میں زوال یافتہ مغلیہ سلطنت کو دوبارہ مستحکم کرنے کے لئے مسلم حکمرانوں کو سیاسی و انتظامی مشورے بھی دئے اور عملی اقدامات بھی کئے جس میں شاہ صاحب کا قائدانہ کردار نمایاں ہے۔
- آپ نے امت کے مختلف طبقات بادشاہ، حکمراں، فوجی سپاہیوں، مشائخ، علماء، صوفیاء، واعظوں، زاہدوں اور اہل صنعت و حرفت وغیرہ کو مخاطب بنا کر ان کو اپنا محاسبہ کرنے اور اصلاح و تبدیلی کی دعوت دی۔
- شاہ صاحب کے افکار و خیالات کی جتنی اہمیت اور ضرورت ان کے عہد میں تھی آج کے دور میں بھی ان کی اتنی ہی معنویت ہے۔

1.7 نمونہ امتحانی سوالات

1.7.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں ارتفاقات کے کتنے مراحل بیان کئے ہیں؟

2.(a) 4.(b) 6.(c) 8.(d)

2. شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد ماجد کا نام بتائے؟

(a). شیخ وجیہ الدین (b). مفتی شمس الدین (c). شاہ عبد الرحیم (d). شاہ عبد العزیز

3. شاہ ولی اللہ دہلوی کس مشہور مدرسہ میں درس دیتے تھے؟

(a). دارالعلوم دیوبند (b). جامعۃ الفلاح (c). ندوۃ العلماء (d). مدرسہ رحیمیہ

4. ان میں سے کون شاہ ولی اللہ کے فرزند نہیں ہیں؟

(a). شاہ عبد السلام (b). شاہ عبد العزیز (c). شاہ رفیع الدین (d). شاہ عبد القادر

5. شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن مجید کا ترجمہ کس زبان میں کیا؟

(a). ہندی (b). اردو (c). انگریزی (d). فارسی

6. شاہ ولی اللہ کہاں پیدا ہوئے؟

(a). دہلی (b). لکھنو (c). مظفر نگر (d). حیدر آباد

7. شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان میں سے کس حدیث کی کتاب کی شرح لکھیں؟

(a). مشکوٰۃ المصابیح (b). موطا امام مالک (c). ترمذی شریف (d). ریاض الصالحین

8. "التفہیمات الالٰہیہ" کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a). شبلی نعمانی (b). امام غزالی (c). شاہ ولی اللہ (d). ابو الکلام آزاد

9. شاہ ولی اللہ دہلوی کا تعلق کس فقہی مسلک سے تھا؟

(a). مالکی (b). حنفی (c). شافعی (d). حنبلی

10. شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب الفوز الکبیر کس موضوع سے متعلق ہے؟

(a). قرآن (b). حدیث (c). فقہ (d). تصوف

1.7.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. قرآن مجید کے حوالے سے شاہ ولی اللہ کی خدمات بیان کیجیے۔
2. فقہ اور فقہی مسالک میں تطبیق کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ کی کوششوں کا جائزہ لیجیے۔
3. شاہ ولی اللہ کے سماجی نظریات کی وضاحت کیجیے۔
4. شاہ ولی اللہ کی حیات کا تعارف پیش کیجیے۔
5. تصوف کے تعلق سے شاہ ولی اللہ کے خیالات پر روشنی ڈالیے۔

1.7.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. شاہ ولی اللہ دہلوی کی تدریسی، علمی اور تصنیفی خدمات پر ایک مضمون لکھیے۔
2. علم حدیث میں شاہ ولی اللہ کی خدمات بیان کیجیے۔
3. امت مسلمہ کے مختلف طبقات کی اصلاح میں شاہ ولی اللہ کی کوششوں کا جائزہ لیجیے۔

1.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تاریخ دعوت وعزیمت : مولانا ابوالحسن علی ندوی
2. تذکرہ شاہ ولی اللہ : مولانا سید مناظر احسن گیلانی
3. شاہ ولی اللہ دہلوی : پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
4. شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے اقتصادی نظریات : ڈاکٹر محمد دین
5. شاہ ولی اللہ حیات وافکار : پروفیسر ظفر احمد نظامی

معروضی سوالات کے جوابات

1. B	2. C	3. D	4.A	5. D
6. A	7. B	8. C	9. B	10 . A

اکائی 2: عبدالحق محدث دہلوی

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 شیخ عبدالحق محدث دہلوی

2.2.1 شیخ کا مدرسہ

2.2.2 حدیث شناسی میں کمال

2.2.3 تالیفات

2.3 فرہنگ

2.4 اکتسابی نتائج

2.5 نمونہ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

2.5.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

2.5.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

2.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

سترہویں صدی میں مسلمانوں کی علمی، سماجی، مذہبی و سیاسی اصلاح کا اصل بیڑہ حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے سر جاتا ہے۔ ان دونوں لوگوں نے اپنے وقت کی مذہبی خرابیوں کو دور کیا اور اسلامی علوم کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو ہندوستان کی مذہبی و اسلامی تاریخ میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ آپ نے طویل عرصے تک درس و تدریس اور وعظ و نصیحت کرنے میں گزارا۔ آپ کا قلم زندگی بھر قرآن و حدیث کی حکمتیں اور تحقیق و تدقیق میں مشغول رہا۔ شیخ محدث کی ذات

تعارف محتاج نہیں، کیوں کہ شیخ کا شمار ہندوستان کے مشہور محدث اور صوفیوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے حدیث کی نشرواشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے دہلی میں اپنا مسند درس قائم کیا اور کوشش کی کہ اس فن کو ہندوستان میں عام کیا جائے۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ عمر بھر حدیث کا درس دیا بلکہ اس کی تعلیم و تعلم کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلے کو ان کی اولاد نے بھی قائم و دائم رکھا۔ مورخین کا یہ ماننا ہے کہ حدیث کو ہندوستان میں عام کرنے کا سہرا شیخ عبدالحق محدث کے سر جاتا ہے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ:

- شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے حالاتِ زندگی اور ان کی شخصیت سے واقف ہو سکیں۔
- ان کی علمی و تصنیفی خدمات کے بارے میں جامع معلومات حاصل کر سکیں۔
- ان کے اصلاحی کارناموں اور تجدیدی کاوشوں سے روشناس ہو سکیں۔
- برصغیر میں علمِ حدیث کے فروغ اور اشاعت کے لیے ان کی خدمات سے متعارف ہو سکیں۔

2.2 شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بزرگ آغا محمد نے تیرہویں صدی عیسوی میں بخارا سے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس وقت دہلی میں علاء الدین خلجی (و:1316ء) کی حکومت تھی، سلطان نے آغا محمد کی مدد کی اور ان کو عہدے بھی عطا کئے۔ اس وقت گجرات کی مہم کی تیاری چل رہی تھی تو آغا محمد کو بھی گجرات روانہ کیا گیا۔ گجرات پر فتح حاصل ہونے کے بعد وہیں مقیم ہو گئے اور سلطان غیاث الدین تغلق (و:1325ء) کے عہد تک وہیں رہے۔ سلطان محمد تغلق (و:1351ء) کے دور میں آغا محمد نے دہلی میں اپنی آخری سانس لی۔ آپ کے والد مولانا سیف الدین1514ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے دینی علوم کی باقاعدہ اور روایتی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن آپ کے اندر وہ تمام صفات موجود تھیں جو علم و فضل سے پیدا ہوتی ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے عہد کا جائزہ لیں تو ان کے کارناموں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی 1551ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ہندوستان میں شیر ساہ سوری (و:1545ء) کی حکومت تھی۔ شیخ محدث دہلوی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، والد سیف الدین نے بچپن سے ہی اپنے بیٹے کی تربیت پر خاص توجہ دی۔ قرآن پاک کی پہلے تعلیم دی اس کے بعد لکھنے کا طریقہ سکھایا، شیخ صاحب ایک ماہ کے مختصر وقفے میں ہی لکھنے کے فن سے واقف ہو گئے۔ سوا سال کے وقفے میں ہی آپ نے زبانی قرآن یاد کر لیا تھا۔ والد صاحب نے روایتی طرز تعلیم کے برعکس جس کتاب کی ضرورت و اہمیت کو سمجھا اس کو پڑھایا۔ تیرہ سال کی عمر تک آپ نے شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھ لی، سولہ سال کی عمر میں مختصر و مطول سے فارغ ہو گئے اور اٹھارہ سال کی عمر تک علوم عقلیہ و نقلیہ کے تمام پہلو سے متعارف ہو چکے تھے۔ عربی و منطق پر ملکہ حاصل کر لینے کے بعد شیخ نے "دانشمندانِ ماوراء النھر" سے استفادہ کے لئے سفر کیا۔ شیخ محدث کو بچپن سے ہی عبادت و ریاضت سے لگاؤ تھا۔ شیخ محدث نے ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ

باطنی علوم پر بھی توجہ دی۔ آپ کے والد نے بچپن میں ہی عشق حقیقی کے وہ جذبات پھونک دیے تھے جو عمر کے آخری وقت تک دلوں کو گرمی پہنچاتے رہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بیس سال کی عمر میں ہی درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنایا۔ لیکن کچھ وقت بعد ہی حرمین کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ رمضان کے مہینے سے کچھ قبل مکہ پہنچ گئے اور وہاں کے محدثین سے صحیح مسلم اور بخاری کا درس لیا۔ شیخ وہاب متقی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ 1587ء میں آپ حجاز پہنچے تھے اور تین سال یہاں قیام کیا۔ شیخ وہاب کی خدمت میں ہی یہ سارا وقت گزارا اور انہوں نے عبدالحق کے علم کی تکمیل کرائی اور احسان و سلوک کے راستوں سے آشنا کیا۔ شیخ وہاب نے ہی آپ کے علم و علمی صلاحیتوں کو صحیح راستے پر لا کھڑا کر دیا۔ حدیث، تصوف اور حقوق العباد سے متعلق اعلیٰ تعلیم آپ نے شیخ عبدالوہاب متقی سے ہی حاصل کی۔ شیخ وہاب نے آپ کو ہندوستان واپس جانے کی ہدایت کی۔ شروع میں شیخ دہلوی اس کے لئے راضی نہیں تھے بلکہ ان کی خواہش تھی کہ وہ بغداد چلے جائیں یا شیخ عبدالوہاب کے ہی پاس رہیں۔ لیکن شیخ عبدالوہاب کے لگاتار اصرار نے شیخ عبدالحق کو ہندوستان واپس جانے پر آمادہ کر لیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے استاد سے کیا سیکھا اور ان کی نصیحتوں نے ان کی زندگی پر کیا اثرات مرتب کئے۔ اس بابت وہ لکھتے ہیں:

"اختلافی اور نزاعی معاملات و مسائل میں ان کی روش نہایت سلامت روی کی تھی۔ بے معنی بحث اور لاحاصل مباحث سے وہ نفرت کرتے تھے اور وحدت وجود کے متعلق ان کا رویہ اس طرح تھا کہ کتب حقائق و توحید مثلاً فصوص الحکم وغیرہ کے سلسلے میں ان کا رویہ توقف و تسلیم کا ہے ان کتابوں کا درس نہیں دیتے اور نہ ان میں اشتغال رکھتے ہیں نہ انکار کرتے ہیں نہ ان کو برا کہتے ہیں ان کی عادت فقہا کی سی نہیں ہے جو ان کتابوں کی طعن تشنیع کرتے ہیں۔

متضاد نظریات و افکار کے ٹکراؤ میں شیخ عبدالوہاب کی ہدایت تھی کہ اول یہ چاہیے کہ اپنا عقیدہ ظاہراً و باطناً اہل سنت کے اعتقاد کے موافق درست اور راسخ کرے پھر عقیدہ مضبوط ہونے کے بعد یہ کرے کہ جو کچھ صوفیہ موحدین نے لکھا ہے اس سے محروم نہ رہے۔ انہوں نے اسرار و معارف میں جو کتابیں لکھی ہیں ان کا مطالعہ کرے جو سمجھ میں نہ آئے اس کو چھوڑ دے۔ اپنی طبیعت میں خلجان نہ پیدا کرے یہ اچھا نہیں کہ ابتدا ہی ان کتابوں سے عقیدہ درست کرنے لگے اور جس کسی سے جو سن لے اس کا پیرو ہو جائے۔۔۔ جو کسی سے سنے اگرچہ وہ باطل ہی ہو مگر جلدی سے انکار نہ کرے۔ اول سن لے پھر سوچے کہ کہنے والے کا مطلب سمجھ میں آگیا یا نہیں پھر اگر اسے حق سمجھے تو قبول کرے ورنہ ردّ کر دے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائے اور اپنے عقیدے میں خلل نہ ڈالے۔

علمائے سو نے اس عہد میں تکفیر و تذلیل کو اہم ترین فریضہ بنا لیا تھا اس کے بارے میں شیخ عبدالوہاب متقی نے فرمایا تھا جس کو دیکھو کہ کلمہ پڑھتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے تو اگر اس سے ایسے کلمات صادر ہوں تو اس کو معذور رکھو اور اس کی تکفیر و تشنیع نہ کرو اور اس کو ملحد نہ بتاؤ۔

سماع کے متعلق جو اس وقت نہایت اختلافی مسئلہ تھا شیخ عبدالوہاب نے کہا تھا کہ نہ مریدین کے سماع کرنے سے راضی ہیں اور نہ مشائخ کے فعل کے منکر۔

علم کی تشریح اور اس کے متعلق ارشاد ہے کہ علم غذا کی مانند ہے جس کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

کچھ لوگوں نے شیخ عبد الوہاب سے کہا تھا کہ مشائخ فرماتے ہیں کہ طالب کو ہمیشہ ذاکر رہنا چاہیے، فرمایا کہ جو کوئی کار خیر میں ہے حقیقت میں وہ ذکر ہی میں ہے، نماز پڑھنا ذکر ہے۔ قرآن پڑھنا ذکر ہے۔ علم دین کا درس ذکر ہے اور جو عمل خیر ہے وہ ذکر ہی ہے (ظاہر ہے اس سے زیادہ جامع اور کامل مفہوم میں ذکر کا بیان کرنا مشکل ہے یہی اس عہد کے تصوف کی تعلیمات کی ترجمانی بھی ہے) (حیات و علمی خدمات شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ص29-30)

شیخ محدث دہلوی جب ہندوستان آئے تو اس وقت اکبر (و:1605ء) ہندوستان کے مذہبی ماحول میں تبدیلی پیدا کر چکا تھا اور اس کی شکل دین الٰہی کے طور پر سامنے آئی۔ بادشاہ وقت کی اس روش نے عوام وخواص کی زندگی پر کافی اثر ڈالا۔ ان حالات کو چار سال پہلے چھوڑ کر جب وہ حجاز گئے تھے تو اس وقت ان برائیوں کی روک تھام کے لئے وہ کچھ نہ کر سکتے تھے اور نہ ہی وہ ذہنی طور پر تیار تھے لیکن حجاز سے واپسی کے بعد ان کی راہ عمل متعین ہو چکی تھی اور دینی علوم کے بیش قیمتی سرمایہ ان کے دل میں محفوظ تھا۔ شیخ محدث دہلوی نے دہلی میں اپنی مسند درس کی شروعات کی، اور یہاں سے شریعت وسنت کی تعلیمات کو عام کرنے لگے۔ درس وتدریس کے اس سلسلے کو آپ نے زندگی کے آخری وقت تک جاری وساری رکھا۔ آپ کے مدرسے کو صرف دہلی میں ہی مقبولیت حاصل نہ تھی بلکہ شمالی ہندوستان کے سبھی مدارس میں ایک مقام حاصل تھا۔ طلباء کی ایک کثیر تعداد اس مدرسے سے استفادہ حاصل کرتی رہی۔ شیخ محدث نے چورانوے (94) سال کی عمر تک ہندوستان کی فضا کو اپنی تعلیمات سے منور رکھا۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی کو دارا شکوہ نے اپنی تصنیف سکینۃ الاولیا میں "امام محدثان و محدث وقت" لکھا ہے۔ شیخ نے اپنی پوری زندگی قرآن وحدیث کے اسرار وحکم کی کشف وتحقیق میں بسر کی ہے اور ان کی زبان وقلم سے نکلا ہر لفظ اثر رکھتا ہے۔ علیم اشرف خان نے اپنی کتاب "حیات وعلمی خدمات شیخ عبد الحق محدث دہلوی" میں ترویج علوم حدیث کے میدان میں اس انداز سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

1. جب شمالی ہندوستان میں علم حدیث ختم ہونے کے دہانے پر تھا اس وقت شیخ محدث نے اپنی انتھک اور پر خلوص کوششوں سے اسے دوبارہ زندگی عطا کی اور نئی روح پھونکی۔
2. کتب احادیث کو اپنے عہد میں نصاب میں لازمی جزو کی حیثیت سے داخل کیا اور اپنے مدرسے میں کتب احادیث کے باقاعدہ درس کی بنیاد ڈالی۔
3. کتب احادیث کو عربی سے فارسی زبان میں منتقل کر کے عوام کے لئے پوشیدہ خزانوں کے دروازے کھول دئے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "شیخ عبد الحق محدثؒ جس دور میں علم وتعلم کے بانی ہوئے اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی تصنیف وتالیف کی بنیاد ڈالی" شیخ محدث دہلوی کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا اور وہ ترجمہ کرنے میں متن کی اصلیت اور روح کو برقرار رکھتے تھے۔

4. شیخ محدث نے مشکوٰۃ کی شرح عربی و فارسی دونوں زبانوں میں لکھی تھی اور مشکوٰۃ کی فارسی شرح عوام و علما کی ضروریات کے تحت ہی تحریر کی گئی تھی۔
5. مشکوٰۃ میں صرف صحابی کا نام اور کتاب کا ذکر ہے اس میں مکمل سلسلۂ اسناد بیان نہیں ہوا ہے اس لئے مبتدی اس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھاسکتے ہیں جب کہ اس کے ترجمے میں قاری کی توجہ مضمون پر مرتکز ہو جاتی ہے اور اسناد کی الجھنوں سے وہ آزاد ہو جاتا ہے۔
6. مشکوٰۃ پر شافعیت کا رنگ غالب تھا مگر شیخ عبدالحق محدثؒ نے اپنی شرح سے اس میں حنفیت کا رنگ بھر دیا ہے۔
7. علم حدیث کے لئے حجاز کی اہمیت کو شیخ عبدالحق نے عوام سے روشناس کرایا اور محدث بننے کے لئے حجاز میں قیام و علمائے حجاز سے استفادہ ضروری سمجھا جانے لگا۔(ص132-133)

برصغیر میں حدیث کے تعلق سے اکثر روایات کو قائم کرنے کا سہرا شیخ عبدالحق محدث کو جاتا ہے۔ شیخ عبدالحق کی اولاد نے بھی ترویج علوم حدیث میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ شیخ محدث کے وقت میں علمائے ہند کی خصوصیت کا مرکز فلسفہ اور علم کلام تھا۔ نیز قرآن وحدیث کو نصاب میں دوسرا درجہ حاصل تھا۔ شیخ محدث نے دینی علوم کی تجدید کی سعی کی، آپ نے اپنے مدرسے میں حدیث و فقہ کی کتابوں کو نصاب میں شامل کیا اور پھر ہم عصر لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ آپ نے فقہ و حدیث میں موافقت پیدا کی، اور فقہ و تصوف کے مابین تعلق کی نشاندہی کی ہے۔ آپ نے مجمع البحرین میں یہ ثابت کیا کہ: ''تصوف اور فقہ کا چولی دامن جیسا ساتھ ہے اور ان میں تضاد کا خیال غلط و گمراہ کن ہے۔ کیوں کہ فقہ و تصوف، شریعت و طریقت، ظاہر و باطن صورت و معنی اور عقل و عشق کا امتزاج ہی مرج البحرین ہو سکتا ہے۔ فقیہ کے لئے تصوف اور صوفی کے لئے فقہ سے واقف ہونا لازمی ہے۔''(ایضاً ص135)

2.2.1 شیخ کا مدرسہ

شیخ عبدالحق کے علم کا چرچا ان کے حجاز جانے سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا لیکن ان کو اصلی شہرت سفر حجاز کے بعد ملی، اس دور میں آپ نے مختلف النوع علمی، دینی اور تعلیمی خدمات انجام دیں۔ حجاز سے واپسی کے بعد آپ نے درس و تدریس پر زور دیا۔ دینی علوم کے فروغ کے لئے بالخصوص علم حدیث کے لئے اپنے آپ کو مخصوص کر دیا۔ اپنے مرشد شیخ عبدالوہاب متقی اور شاہ ابوالمعالی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سفر، لوگوں سے ملاقاتیں اور دہلی سے باہر جانا بالکل ترک کر دیا۔ درس و تدریس کے لئے جو مدرسہ آپ نے قائم کیا تھا اس کے اندر ایک نئے نظام تعلیم کو متعارف کرایا جو اس وقت کے رائج نصاب سے مختلف تھا۔ اس وقت کے نصاب میں قرآن مجید و حدیث نبوی کو تعلیم و تعلم میں وہ مرتبہ نہیں حاصل تھا۔ اس بابت نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

''علم حدیث کا سرے سے کوئی چرچا نہ تھا، لوگ نہ خود اس کی جانب مائل تھے اور نہ دوسروں کو اس کے حصول کی کوئی ترغیب دیتے تھے، وہ اس فن سے نہ آشنا، اس کی کتابوں سے ناواقف اور محدثین کے ناموں سے بے خبر تھے، بہت تھوڑے لوگ صرف مشکوٰۃ پڑھ لیتے تھے، اور وہ بھی محض حصول برکت کے لئے، اس پر عمل کرنا اور اس کو سمجھنا ان کا مقصد نہ ہوتا، فقہ میں صرف فقہ حنفی اور علمائے ماوراء

النہر کے فتووں اور اجتہادات پر قانع ہو گئے تھے، اور محض فروع و جزئیات میں الجھے رہتے تھے، ان کا راس المال فقہ تھی، وہ بھی تقلیدی رنگ و انداز میں، تحقیق سے معدودے چند لوگوں ہی کو دلچسپی تھی۔ "(الحط فی ذکر الصحاح الستہ ص70)

علمائے کرام نصوص کا خیال نہیں رکھتے، اور نہ بحث واستدلال میں حدیث کو اہمیت دیتے تھے، اجتہاد و تحقیق کا تو سرے سے ہی دروازہ بند تھا۔ فقہی اقوال کو قرآن وحدیث کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے قرآن وحدیث کا معیار فقہ کو بنالیا گیا تھا۔ شرعی معاملات جو بالکل واضح ہیں اس میں بھی بلا جھجک توجیہ و تاویل کی جاتی، یا سرے سے ہی ان کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ معقولات کی طرف میلان اور فلسفہ و کلام میں افراط کے سبب دین کی اصل حقیقت اور ظاہری صورت متاثر ہونے لگی تھی۔ شریعتِ محمدی کی روح رفتہ رفتہ غائب ہوتی جارہی تھی اور بدعت و گمراہی کا غلبہ بڑھتا جارہا تھا۔ حدیثِ نبوی سے بے اعتنائی و بے رغبتی اور منطق و فلسفہ سے غیر معمولی میلان کا ایک نمایاں سبب یہ گردانا جاتا تھا کہ ایران سے آنے والے علما کے ذریعے خصوصاً ہندوستان میں علومِ عقلیہ کو بڑے پیمانے پر رواج اور فروغ دیا گیا۔ اس وقت کے سلاطین و امرا ریاستی معاملات کی الجھنیں سلجھانے اور بغاوتوں و شورشوں کو دبانے میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ ان کی توجہ دوسری طرف کم ہی جاپاتی تھی۔ ایسے میں وہ لوگ تعلیم و تعلم کے نظم و نسق کو کس طرح بحسن وخوبی انجام دے پاتے۔ حالانکہ دہلی سے فاصلے پر بعض علما کے قائم کردہ علومِ دینی کے مراکز موجود تھے۔ ان مراکز میں اکثر و بیشتر کتاب و سنت کے بجائے معقولات اور متاخرین علما کی تصنیفات کو درس و تدریس کا محور بنایا گیا تھا۔ شیخ محدث کی شخصیت حجاز وہندوستان کے علمائے کرام سے تعلیم حاصل کر چکی تھی۔ یہ منظر نامہ اس وقت کا تھا جب شیخ عبدالحق محدث دہلوی مسند درس پر فائز ہوئے، اور ایک دینی مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ آپ نے اس ماحول میں علم دین کی شمع جلائی اور علمائے کرام کو لایعنی باتوں، مذہبی مناقشوں اور پیچیدہ مباحثوں سے بچنے اور قوم کو قرآن و سنت کی تعلیم کی طرف مائل ہونے کی دعوت دی۔ آپ کی وجہ سے دینی علوم خصوصاً حدیث کو ہندوستان میں اہم مقام حاصل ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کی مساعی سے ہی شمالی ہندوستان میں کتاب و سنت کی تعلیم عام ہوئی۔

2.2.2 حدیث شناسی میں کمال

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو علم حدیث میں امتیاز حاصل تھا، اس میدان میں آپ کے کارناموں و خدمات کی وجہ سے محدث آپ کے نام کا جز بن گیا ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی اس فن کے ساتھ جڑے رہ کر نمایاں خدمات انجام دیں، جس کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ تصنیفات، تراجم اور شروحات پر مشتمل ایک قیمتی اور دیرپا علمی ذخیرہ منظر عام پر آیا۔ ان کی مایہ ناز تصنیف اس بات کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ وہ احادیث کے پیچیدہ مسائل اور پوشیدہ نکات کو سمجھنے میں بے حد ماہر تھے اور اس میدان میں ان کی مہارت غیر معمولی تھی۔ فن حدیث میں شیخ کی خدمات و کمالات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ ان کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں علم حدیث کو نمایاں فروغ دیا۔ حجاز سے واپسی کے بعد وہ عمر بھر اسی علم کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے زمانے میں کتاب و سنت کے بجائے دوسرے علوم وفنون لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے، اس لئے شیخ نے حدیث کے علم پر زیادہ توجہ دی، اس کے نتیجے میں علم حدیث کو ایک نئی زندگی ملی۔ شیخ نے اس علم پر اس لیے زیادہ دھیان دیا کیونکہ ان کے وقت میں لوگ کتاب و سنت چھوڑ کر دوسرے علوم وفنون میں

لگے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ان کی اور ان کے خاندان کی خاص بات یہ ہے کہ ان کی وجہ سے صدیوں تک حدیث کا علم جاری رہا۔ اصل میں انہوں نے حدیث کے علم میں بہت سے بنیادی اور اہم کام انجام دیے، جس کی بدولت آگے چل کر اس میدان میں قابل ذکر ترقی ہوئی۔ ہندوستان کی دینی اور علمی تاریخ میں اور احادیث کو عام کرنے میں شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام بہت بڑا ہے، لیکن ان کاموں کی شروعات شیخ عبدالحق محدث نے ہی کی تھی۔ شاہ صاحب نے انہی کے شروع کیے ہوئے طریقوں کو آگے بڑھایا اور مکمل کیا۔

2.2.3 تالیفات

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی عمر کا زیادہ تر عرصہ تصنیف و تالیف میں گزارا۔ آپ نے حدیث کے علاوہ سب سے زیادہ توجہ سیرۃ النبی پر رکھی۔ عبدالحمید لاہوری و دیگر مورخین نے ان کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں سے زائد شمار کی ہیں۔ شیخ محدث نے ایک رسالہ "تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف" میں فہرست فراہم کی ہے۔ جس میں 49 کتابوں کے نام درج ہیں اور ایک کتاب "المکاتیب والرسائل" میں 68 رسائل شامل ہیں۔ حالانکہ ان کی کتابوں کی فہرست ساٹھ ہے۔ ان تمام تصانیف کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہے کہ ان کی کاوشوں کا محور شریعت و سنت ہی ہے۔ آپ کی تصانیف کے موضوعات تفسیر، حدیث، عقائد، فقہ و تصوف وغیرہ ہیں۔ تفسیر سے متعلق آپ کی تین تصانیف کا ذکر ہے۔(1)تعلیق الحاوی علی تفسیر البیضاوی۔ اس کے کچھ حصہ پر آپ نے حاشیہ لکھا ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ تفسیر کے موثر و معتبر اجزاء کو سامنے لایا جائے۔ اس کے علاوہ مشکل مباحث کو الگ کر دیا جائے تا کہ لوگ اس سے آسانی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ حالانکہ اس کا نسخہ اب موجود نہیں ہے۔(2)شرح صدور تفسیر آیت النور(3)تحصیل الغنائم والبرکات بہ تفسیر سورۃ العادیات۔ شیخ عبدالحق کی نمایاں خدمات حدیث کی ترویج و اشاعت میں ہے۔ اس میدان میں کئی ضخیم کتابیں آپ نے لکھی۔ مثلاً اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ، یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے اور مطبع نول کشور سے شائع ہوئی، 2655 صفحات پر ہے۔ لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح، یہ عربی زبان میں مشکوٰۃ کی شرح ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اشعۃ اللمعات کی تصنیف میں بعض مضامین ایسے آئے جس کی تشریح کو آپ نے فارسی زبان میں مناسب سمجھا اس کی وجہ یہ تھی کہ فارسی اس وقت عوام کی زبان تھی۔ اس بحثوں میں عوام کو شامل کرنا آپ نے مناسب نہیں سمجھا۔ یہ کتاب شائع نہ ہو سکی لیکن قلمی نسخے بانکی پور، حیدرآباد، دہلی اور علی گڑھ کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ آپ نے مدارج النبوۃ کے نام سے سیرۃ النبیؐ کے عنوان پر تفصیل سے تحریر کیا۔ اس کے علاوہ مدینۃ النبی کی تاریخ میں جذب القلوب فی دیار المحبوب بھی شہرت کی حامل ہے اس کا اردو ترجمہ تاریخ مدینہ منورہ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مشہور کتابوں میں ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین ،وغیرہ شامل ہیں۔

1. اشعۃ اللمعات

یہ کتاب مشکوۃ المصابیح کی فارسی زبان میں مکمل و جامع شرح ہے۔ یہ کتاب چھ برس میں مکمل ہوئی اس کتاب کی شرح لکھنے کی شروعات 1610ء میں ہوئی اور 1616ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ چار جلدوں پر مشتمل اس کتاب کی وجہ سے ہندوستان میں حدیث کی تعلیم کی

طرف لوگوں کی توجہ بڑھی اور عام لوگوں میں بھی اس کا شوق پیدا ہوا۔ نول کشور پریس نے یہ کتاب چھاپی ہے۔ اس کی چار جلدوں میں مضامین کو یوں ترتیب دیا گیا ہے۔ ابتدا میں حدیث اور محدثین کے بارے میں انتالیس صفحات کا ایک بڑا مقدمہ ہے، جس میں حدیث کی تعلیم اور حدیث کی قسموں پر علمی و فکری اعتبار سے وقیع تبصرہ کیا ہے۔ چار جلدوں کے مندرجات و مباحث کو منظم انداز میں پیش کیا ہے۔

پہلی جلد میں مقدمہ کے بعد درج ذیل پانچ کتب کا ذکر ہے۔ کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارہ، کتاب الصلٰوۃ، کتاب الجنائز۔

دوسری جلد چھ کتب پر مشتمل ہے۔ کتاب الزکوۃ، کتاب الصوم، کتاب فضائل القرآن، کتاب الدعوات، کتاب اسماء اللہ تعالیٰ، کتاب المناسک۔

تیسری جلد میں نو کتب کا مجموعہ ہے۔ کتاب البیوع، کتاب العتق، کتاب الحدود، کتاب الامارۃ والقضا، کتاب الجہاد، کتاب الصید والذبائح، کتاب الاطعمہ، کتاب اللباس، کتاب الطب والرقی۔

چوتھی جلد میں کتاب الآداب و کتاب الفتن شامل ہیں۔

چاروں جلدیں 2655 صفحات پر مشتمل ہیں، گویا شیخ محدث نے شرح کا پورا حق ان ڈھائی ہزار صفحات میں ادا کر دیا ہے۔

نمایاں خدوخال

اس کتاب کی اہم اور نمایاں خصوصیات کو ضیاء الدین اصلاحی نے اپنے مضمون "شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعض امتیازی کارنامے" کو اس طرح بیان کیا ہے:

1. ترجمہ و تشریح میں عام فہم، سہل، دلچسپ اور دلنشیں انداز و پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے حدیث کا مطلب و مفہوم اچھی طرح واضح ہو گیا ہے اور عام لوگوں کے لئے بھی اس سے فائدہ اٹھانا ممکن اور آسان ہو گیا ہے۔
2. اس میں اہم مسائل و مباحث سے بھی بقدر ضرورت تعرض کیا گیا ہے، لیکن ان پر اس طرح بحث و گفتگو کی ہے کہ پڑھنے والا دقیق امور میں الجھے بغیر حدیث کی روح و منشا سے واقف ہو جاتا ہے، ایسے موقع پر تفصیل و اطناب اور غیر متعلق مباحث سے پرہیز کیا گیا ہے تاکہ قاری کو اکتاہٹ اور گھبراہٹ نہ ہو۔
3. اختصار کے باوجود مفہوم و مطلب کے سمجھنے میں خلل اور دشواری نہیں ہوتی۔
4. شارح نے احادیث سے دلچسپ استنباط و استخراج کیا ہے۔
5. دفع تعارض پر خاص توجہ دی ہے اور مختلف و بظاہر متضاد حدیثوں میں جمع و تطبیق سے کام لیا ہے۔
6. تشریح و تفہیم کے لئے آیات قرآنی و احادیث نبوی سے استشہاد کیا ہے اور ائمہ دین، محدثین اور شراح حدیث کے اقوال بھی پیش کئے ہیں۔
7. حنفی مذہب کو شرح و بسط کے ساتھ مدلل بیان کیا ہے اور اسے حدیث کے مطابق قرار دینے پر زور دیا ہے، اس کے ساتھ ہی

دوسرے فقہاء و مجتہدین کے اقوال و دلائل بھی ذکر کئے ہیں۔

8. الفاظ کی تحقیق اور راویوں کے بارے میں معلومات تحریر کئے ہیں۔

9. یہ شرح جس طرح عام لوگوں کے لئے مفید اور کارآمد ہے، اسی طرح اہل علم اور خواص کے لئے بھی مفید ہے، اساتذہ و طلبہ دونوں اس سے مستفید ہوتے ہیں، اپنی اس خصوصیت کی بنا پر یہ ہمیشہ اہل علم میں قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھی گئی، چونکہ مشکوٰۃ اکثر مدارس کے نصاب میں داخل ہے، اس لئے اس شرح سے بھی خاص طور پر استفادہ کیا جاتا ہے، علاوہ ازیں شیخ کا مقدمہ اکثر مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ (ص192-193 معارف، ستمبر 1988ء)

2. مدارج النبوۃ

اس کتاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سبھی گوشے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شیخ عبد الحق محدث کی علمی و ادبی شاہکار کے طور پر اس کتاب کو دیکھا جاتا ہے۔ اس کتاب سے پہلے اتنی تفصیل سے آپؐ کی شخصیت پر اتنی تفصیل سے نہیں لکھا گیا تھا۔ اس کتاب کو لکھنے کی اصل وجہ اس وقت کے حالات ہیں۔ مغل حکومت میں اکبر کا عہد جس میں لوگ شریعت و سنت سے بے اعتنائی برت رہے تھے اور سرور کائنات سے لوگوں کا رشتہ کمزور پڑ رہا تھا۔ ایسے حالات میں ضروری تھا کہ آپؐ کی زندگی کے متعلق لوگوں کو روشناس کرایا جائے۔ یہ کتاب اصلاً فارسی میں لکھی گئی ہے اس کا اردو ترجمہ مفتی غلام معین الدین نعیمی صاحب نے کیا ہے۔ جولائی 2004ء میں یہ ترجمہ شبیر برادرز لاہور نے شائع کروایا ہے۔

3. اخبار الاخیار

اس کتاب میں شیخ صاحب نے ہندوستان کے علما و مشائخ پر روشنی ڈالی ہے۔

عبد القادر جیلانی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے عہد کے سبھی مشہور صوفیا و علما کے حالات کو لکھا ہے۔ طبقہ اول میں خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری کو شامل کرتے ہوئے 22 لوگوں کے حالات لکھے ہیں۔ دوسرے طبقہ میں فرید الدین گنج شکر اور خواجہ نظام الدین اولیاء اور اس کے علاوہ تیسرے طبقے میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے لے کر مولانا بحثی تک کے حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے بعد چند صالح خواتین کے عنوان سے 5 عورتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ آخر میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے خاندانی حالات کا ذکر ہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کی وفات 21 ربیع الاول 1642ء کو ہوئی۔ آپ نے تقریباً 94 برس کی عمر پائی اور اس طویل عرصے میں علومِ حدیث اور دینی علوم کی ترویج و اشاعت میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ شیخ محدث نے تبلیغ دین، ترویج دین اور تصحیح عقائد کی سعی اپنی پوری زندگی کی۔ آپ کی ہی ذات سے برصغیر میں حدیث کے علوم کے چشمے وا ہوئے، آپ نے باون سال کا طویل عرصے تک مسند حدیث گرم رکھی، اور زندگی کے آخری حصے تک بد دینی اور بد عقیدگی مٹانے کی مسلسل جدوجہد کی۔ مشہور مغل بادشاہ اکبر کے دور میں جب دین الٰہی کے فتنہ اپنی پوری قوت کے ساتھ نمودار ہوا تو علما و مشائخ کی ایک کثیر تعداد اس کے سامنے گردن خم کئے نظر آئے تو دوسری طرف کچھ خوف خدا رکھنے والے علما نے اس فتنے کو پوری طاقت سے روکنے کی کوشش کی۔ اس فتنے کے سامنے مضبوط دیوار شیخ عبد الحق محدث

دہلوی کی شخصیت تھی۔ شیخ محدث اپنے ہاتھ میں کتاب وسنت کا چراغ لئے دلوں کی گرد وغبار کو صاف کر رہے تھے۔ شیخ محدث اپنے عہد کے نہ صرف شیخ الحدیث تھے بلکہ جلیل القدر مفسر، وسیع النظر فقیہہ، مستند مورخ وسیرت نگار اور اچھے شاعر بھی تھے۔

2.3 فرہنگ

سلامت روی	:	امن پسندی، صلح جوئی، سلامتی کی راہ پر چلنا
اشتغال	:	پوری توجہ سے کسی کام میں مشغول ہونا، مشغولیت، مصروفیت
تشنیع	:	طعنہ، ملامت، برا بھلا کہنے کا عمل
روش	:	طرزِ عمل، رویّہ، رفتار، چال، چلن
مسند درس	:	پڑھانے کی منزل، پڑھانے کا منصب یا مقام، درس دینے کی جگہ
ید طولیٰ	:	دسترس، کمال، مہارت، ملکہ
بے اعتنائی	:	توجہ نہ دینا، دھیان نہ دینا، نظر انداز کرنا

2.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے بزرگ آغا محمد نے تیرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا رخ کیا۔ اس وقت دہلی میں علاء الدین خلجی کی حکومت تھی، سلطان نے آغا محمد کی مدد کی اور ان کو عہدے بھی عطا کئے۔ اس وقت گجرات کی مہم تیاری چل رہی تھی تو آغا محمد کو بھی گجرات روانہ کیا گیا۔ گجرات پر فتح حاصل ہونے کے بعد وہیں مقیم ہو گئے اور سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد تک وہیں رہے۔ سلطان محمد تغلق کے دور میں آغا محمد نے دہلی میں اپنی آخری سانس لی۔
- شیخ محدث نے تبلیغ دین، ترویج دین اور تصحیح عقائد کی سعی اپنی پوری زندگی کی۔ آپ کی ہی ذات سے برصغیر میں حدیث کے علوم کے چشمے وا ہوئے، آپ نے باون سال کا طویل عرصے تک مسند حدیث آباد رکھی، اور زندگی کے آخری حصے تک بد دینی اور بد عقیدگی مٹانے کے لئے مسلسل جدوجہد کی۔
- شیخ عبد الحق محدث دہلوی کو علم حدیث میں امتیاز حاصل تھا، اس میدان میں آپ کے کارناموں وخدمات کی وجہ سے محدث آپ کے نام کا جز بن گیا ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی اس فن کے ساتھ جڑے رہ کر نمایاں خدمات انجام دیں، جس کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ تصنیفات، تراجم اور شروحات پر مشتمل ایک قیمتی اور دیرپا علمی ذخیرہ منظر عام پر آیا۔

2.5 نمونہ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. شیخ محدث دہلوی کب پیدا ہوئے؟

(a).1605ء (b).1505ء (c).1535ء (d).1551ء

2. برصغیر میں حدیث کے تعلق سے اکثر روایات کو قائم کرنے کا سہرا کس کے سر جاتا ہے؟

(a). شیخ عبدالحق محدث دہلوی (b). علامہ شبلی نعمانی (c). علامہ اقبال (d). اشرف علی تھانوی

3. کتاب "مدارج النبوۃ" میں کس موضوع پر بحث کی گئی ہے؟

(a). سیرت (b). فقہ (c). تصوف (d). سب غلط

4. کتاب "مدارج النبوۃ" کس زبان میں لکھی گئی ہے؟

(a). اردو (b). عربی (c). فارسی (d). انگریزی

5. "اخبار الاخیار" کس کی تصنیف ہے؟

(a). علامہ شبلی نعمانی (b). عبدالحق محدث دہلوی (c). شاہ ولی اللہ (d). نواب صدیق حسن خاں

6. "اشعۃ اللمعات" کس مشہور کتاب کی شرح ہے؟

(a). مشکوٰۃ المصابیح (b). مرج البحرین (c). مدارج النبوہ (d). سب غلط

7. "مشکوٰۃ المصابیح" کی شرح فارسی میں کس نے لکھی؟

(a). شیخ عبدالحق محدث دہلوی (b). شیخ نصیر الدین (c). بختیار کاکی (d). سب غلط

8. شیخ محدث دہلوی کی وفات کب ہوئی؟

(a).1642ء (b).1551ء (c).1700ء (d).1758ء

9. اشعۃ اللمعات کتنی جلدوں پر مشتمل ہے؟

(a).2جلد (b).8جلد (c).6جلد (d).4جلد

10. شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کس کتاب میں ہندوستان کے علما و مشائخ پر روشنی ڈالی ہے؟

(a). مدراج النبوۃ (b). اخبار الاخیار (c). اشعۃ اللمعات (d). سب صحیح

2.5.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ابتدائی حالات بیان کیجیے۔
2. عبدالحق محدث کے علمی ذوق پر روشنی ڈالیے۔
3. اشعۃ اللمعات پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
4. اخبار الاخیار کا تعارف پیش کیجیے۔
5. مدارج النبوہ پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

2.5.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. شیخ عبدالحق محدث کی اصلاحی کوششوں کا جائزہ لیجیے۔
2. شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیفات کا جائزہ لیجیے۔
3. شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ابتدائی حالات و تعلیمی سفر پر گفتگو کیجیے۔

2.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، اردو بازار دہلی، 1964
2. اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، (مترجم اردو) مولانا سبحان محمود و مولانا محمد فاضل، اکبر بک سیلر، لاہور، 2004
3. حیات و علمی خدمات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ڈاکٹر علیم اشرف خان، اسلامک ونڈرس بیورو، نئی دہلی، 2001
4. شیخ عبدالحق محدث دہلوی موضوعاتی مطالعہ، ڈاکٹر محمد یونس قادری، مکتبۂ الحق، کراچی، 2001

معروضی سوالات کے جوابات

1. D	2.A	3.A	4.C	5.B
6. A	7.A	8.A	9.C	10.B

اکائی 3: سید احمد رائے بریلوی

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 سید احمد رائے بریلوی

3.3 تحریک مجاہدین (شہیدین)

3.3.1 مقاصد

3.3.2 تحریک کا ارتقائی سفر

3.3.3 اختتامی مرحلہ: معرکہ بالاکوٹ

3.4 ناکامی کے اسباب

3.4.1 تحریک کا فکری تسلسل اور وراثت

3.5 فرہنگ

3.6 اکتسابی نتائج

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.7.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

3.7.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

3.7.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

عزیز طلبہ آپ نے پچھلی اکائیوں میں ہندوستان کی تاریخ پر گہرا اثر مرتب کرنے والی شخصیات میں عبد الحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ کے بارے میں پڑھا۔ اس اکائی میں ہم اٹھارویں صدی عیسوی کی ایک اور معروف شخصیت حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی کے بارے میں پڑھیں گے۔ ان کی شخصیت کا ہندوستان کی تاریخ پر بہت گہرا اثر پڑا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے ہدایت خلق اور حفاظت اسلام کا کام لیا۔ آپ نے اپنی بیشتر عمر کفر و شرک کے خلاف مزاحمت اور اعلائے کلمہ حق میں بسر کی اور اسی فکر کے ساتھ جہاد کیا اور شہید ہوئے۔ آپ کے بعد آپ کے مریدین و متبعین نے انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں رونما ہونے والی آزادی کی تحریکوں میں اہم کردار ادا کیا۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ:

- سید احمد شہید رائے بریلوی کی حیات اور ان کی ملی خدمات کا مطالعہ کر سکیں۔
- تحریک مجاہدین المعروف تحریک شہیدین کے قیام کے اسباب و اثرات کا تجزیہ کر سکیں۔
- سید احمد شہید کی شہادت اور تحریک کی ناکامی اور اثرات کا خلاصہ کر سکیں۔

3.2 سید احمد رائے بریلوی

سید احمد شہید اتر پردیش کے شہر رائے بریلی کے قصبہ دائرہ شاہ علم اللہ میں 6 صفر 1201ھ مطابق سن 1786ء میں پیدا ہوئے۔ سید احمد کی عمر جب بارہ سال تھی والد وفات پا گئے تھے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سید محمد عرفان بن سید نور تھا اور کئی واسطوں سے ان کا نسب حسن مثنی بن امام حسن بن علی ابن علی طالب سے جا ملتا ہے۔ حسن مثنی کا نکاح حضرت حسین بن علی کی صاحبزادی فاطمہ صغری سے ہوا تھا، اس نسبت سے سید احمد بریلوی کا خاندان حسنی اور حسینی کہلاتا تھا۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

آپ کی تعلیم کا آغاز چار سال کی عمر میں ہوا۔ تین برس تک آپ مکتب پابندی سے جاتے رہے۔ اس عرصے میں قرآن کی چند سورتیں حفظ کیں اور لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا۔ لیکن اپنے ہم عمروں کی طرح مہارت حاصل نہ کی۔ فارسی بہت عمدہ بول لیتے تھے اور عربی زبان میں مشکوۃ المصابیح جیسی کتب پڑھ لیتے تھے۔ اس دور کے شعراء حافظ اور بیدل کے اشعار بھی خوب ازبر تھے۔ ذہین ہونے کے باوجود انہیں کتب سے کوئی اشغال نہ تھا۔ اس کے برخلاف آپ کو کھیلوں کا بہت شوق تھا۔ ان کی طبیعت میں جوش و بہادری زیادہ تھی۔ کم سنی سے ہی بہادری کے کام اور ایسے کھیلوں سے رغبت تھی جس میں جسمانی طاقت صرف ہوتی۔

مولانا ابو الحسن علی ندوی اپنی کتاب 'سیرت سید احمد شہید' میں لکھتے ہیں کی سید صاحب کبڈی بڑے شوق سے کھیلتے تھے۔ آپ کو

مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں میں نہایت دلچسپی تھی۔ اکثر لڑکوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے اور کھیل میں ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعے پر حملہ کرتا اور فتح کی کوشش کرتا تھا۔ سید صاحب جسمانی طور پر کافی مضبوط اور غیر معمولی قوت کے حامل تھے، فطرتاً بہادر اور جرات مند تھے اور ظلم کے خلاف جرات سے کھڑے ہونے کا جذبہ تھا اور عہد طفلی سے ہی یہ بات دل میں بیٹھ گئی تھی کہ وہ کافروں سے جہاد کریں گے۔ تواریخ عجیبیہ میں ہے کی 'بستی کے لڑکوں کے ساتھ مل کر سید صاحب لشکر تیار کرتے اور اسے اسلامی لشکر کا نام دے کر بطور جہاد با آواز بلند تکبیریں کہتے۔ اور ایک فرضی لشکرِ کفار پر حملے کرتے'۔ اسی اعتبار سے بچپن سے ہی مختلف ورزشوں کا اہتمام تھا۔ ابتدائی عمر میں ہی آپ نے تلوار، تیر کمان، بندوق اور جتنے فنون جیسے تیراکی، چابک دستی وغیرہ جو اس زمانے میں رائج تھے سب سیکھ لیے تھے۔

سید صاحب میں خدمت خلق کی صفت بھی بدرجہ اولی موجود تھی۔ صاحب مخزن احمدی نے لکھا ہے کہ "آپ جب سن تمیز کو پہنچے تو خدمت خلق کو اپنا شعار خاص بنالیا۔ اس لیے بوڑھوں، معذورین اور بیواؤں کی خدمت کرنے میں ہمیشہ آگے رہتے تھے۔ اس میں امیر غریب یا اونچ نیچ کی کوئی قید نہ تھی۔ اہل محلہ سب کے سب ان کے خاندان کے مرید تھے، لہذا آپ کی خدمت کے داعیہ سے نہایت پریشان ہوتے اور برادری کے لوگ ملامت کرتے لیکن آپ نے خدمت کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا"۔

لکھنؤ اور دہلی کے اسفار

سید صاحب 18 سال کی عمر میں اپنے کچھ رشتہ داروں کے ساتھ لکھنؤ کا قصد کیا۔ آپ کے تمام ساتھیوں نے فکر معاش اور حصول روزگار کی نیت سے رخت سفر باندھا، لیکن سید صاحب کا مقصد ان سے بالکل جدا اور اعلی تھا۔ یہ جماعت آٹھ افراد پر مشتمل تھی۔ آٹھ لوگوں میں سواری صرف ایک تھی اور سفر لمبا تھا چنانچہ مشورہ سے سب باری باری دو کوس سوار ہوتے تھے۔ سید صاحب کے مزاج میں استغنا اور دوسروں سے ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس لیے اپنی باری کے وقت باصرار کسی اور کو سوار کر دیتے اور خود پیدل چلتے رہتے یہاں تک کہ 49 میل کا سفر پیدل طے کر کے منزل مقصود تک پہنچے۔

لکھنؤ پہنچ کر سب ساتھی تلاش معاش میں مشغول ہو گئے۔ سید صاحب کا قیام ایک امیر نواب سعادت علی خان، جو ان کے والد کا نیاز مند تھے، کے گھر تھا چنانچہ ان کا کھانا امیر کے گھر سے آتا۔ سید صاحب اس کو خود نوش فرمانے کے بجائے اپنے ساتھیوں کو دے دیتے اور ان کا روکھا سوکھا کھانا خود کھاتے۔ لکھنؤ کے قیام میں باوجود تگ و دو کے معاش کا مسئلہ حل نہ ہوا کیوں کہ بے روزگاری عام تھی۔

سید صاحب اپنے ساتھیوں کو بار بار نصیحت کرتے کہ وہ روزگار کی فکر چھوڑ کر دہلی کا قصد کریں اور شاہ عبد العزیز سے کسب فیض کریں۔ جب آپ عزیزوں کو قائل نہ کر سکے تو کچھ عرصے میں انہوں نے دہلی کا قصد کیا اور دہلی پہنچ گئے۔ جہاں ان کا پرتپاک خیر مقدم ہوا اور شاہ عبد العزیز نے احوال سن کر فرمایا کہ: "خدا کا فضل شامل حال رہا تو اپنی پدری اور مادری وارثت حاصل کر لوگے"۔

سلام مسنون کا مسئلہ

روایتوں میں یہ بات آئی ہندوستان میں فکری پسماندگی اور اسلامی تعلیمات سے اتنی دوری آچکی تھی کہ مختلف تکلفات و بدعات جڑ

پکڑ چکی تھیں۔ جن میں ایک یہ بھی تھی کہ سلام مسنون کے بجائے، تسلیم، آداب' وغیرہ کے لفظ بولے جاتے تھے۔ اور بعض معزز گھرانوں میں تو شرعی سلام کو آدابِ مجلس کے منافی سمجھا جاتا تھا۔

سید صاحب جب دہلی پہنچے تو شاہ عبد العزیز کے خاندان میں بھی سلام کا رواج باقی نہ رہا تھا۔ بلکہ اس وقت کے رواج کے مطابق ' اپنے نام کے ساتھ تسلیمات عرض کرتا ہے' کے ساتھ سلام پیش کیا جاتا تھا۔ مثلاً 'عبد العزیز تسلیمات عرض کرتا ہے'۔ جب سید صاحب پہنچے تو انہوں نے 'السلام علیکم' کہا۔ تو شاہ صاحب اس پر بہت خوش ہوئے اور سب کو آئندہ اسی طرح سلام کرنے کا حکم دیا۔

دہلی میں انہوں نے علم کے حصول کی ہر ممکن کوشش کی۔ مولوی عبد القیوم جو ان کے استاد ہیں، فرماتے ہیں تحصیل علم کے دوران سید صاحب کی شکایت ہوتی تھی کہ جب وہ کتاب کو دیکھتے ہیں تو الفاظ ان کے سامنے سے غائب ہو جاتے ہیں۔ سب نے خیال کیا کہ شاید کوئی بیماری ہو گئی ہے۔ طبیب سے رجوع کیا گیا مگر یہ کیفیت ختم نہ ہوئی۔ شاہ عبد العزیزؒ تک بات پہنچی تو انہوں نے فرمایا کہ مہین جالی دار چیزوں پر نظر جما کر تجربہ کرو۔ لیکن وہ باریک سے باریک چیز کو دیکھ سکتے تھے۔ یہ مسئلہ صرف کتب کے ساتھ خاص تھا۔ تب شاہ صاحب نے کہا کہ علم ظاہری کے لیے ان پر زور نہ ڈالا جائے شاید انہیں علم لدنی حاصل ہو گا۔ چنانچہ تاریخ میں آتا ہے کہ بے شک انہیں کتابی علوم میں وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو شاہ اسمٰعیل اور شاہ عبد العزیز کو حاصل تھا لیکن آیات و احادیث کے معارف بیان کرنے میں بہت اعلی درجہ پر تھے۔ شرعی اوامر و نواہی سے بخوبی واقف تھے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔

بیعت و سلوک

سید صاحب نے سن 1222ھ میں شاہ عبد العزیزؒ سے بیعت کی۔ اس وقت ہندوستان میں تصوف کے تین سلسلے نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ رائج تھے۔ بیعت کے وقت سالک کے عرض کے مطابق بیعت کی جاتی تھی۔ سید صاحب نے تینوں سلسلوں میں بیعت کی اور سلوک کی منازل بڑی تیزی سے طے کر لیں۔

دہلی میں تقریباً پانچ سال گذارنے کے بعد آپ نے دوبارہ لکھنؤ کا سفر کیا وہاں کچھ عرصے قیام کے بعد 25 سال کی عمر میں امیر خان، جو کہ ایک فوجی مہم جُو تھے، کے ہاں ملازمت کر لی۔ انہوں نے امیر خاں کی ملازمت میں سات سال گزارے۔

سید صاحب نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ بدعات و خرافات پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کی اور احیائے سنت میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ آپ نے اپنے زمانے میں ایسی ایسی سنتوں کو زندہ کیا جو مفقود ہو چکیں تھیں۔ اس کے علاوہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے۔

سید احمد شہید کے بارے میں ان کے دور کے ایک مفکر اور صاحب نظر عالم مولوی عبد الاحد لکھتے ہیں کہ: ''حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر 40،000 چالیس ہزار سے زیادہ مشرک توحید کے پرچم تلے آئے اور مسلمان ہوئے اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر اصلاح عقیدہ بیعت کی اور جو سلسلہ بیعت آپ کے خلفاء کے روئے زمین پر جاری ہے، اس سلسلہ میں کروڑوں آدمی آپ کے ہاتھ پر بیعت

ہیں"۔

تصنیف و تالیفات

سید صاحب نے دعوت و اصلاح کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کی خدمت بھی انجام دی۔ آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف مشہور ہیں:

حقیقت الصلاۃ: یہ نماز کے اسرار اور سورہ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل دو تقریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ رسالہ حقیقت الصلاۃ کے نام سے 1237ھ میں شائع ہوا، پھر مطبع اسرار کریمی، الہ آباد سے 1949ء میں بعنوان: "انوار الصلاۃ" شائع ہوا۔ یہ دراصل سنہ 1235ھ میں لکھنؤ کے چند جید علما کے سامنے کی گئی تقریر پر مبنی ہے۔

رسالۂ اشغال: یہ رسالہ سید صاحب نے شہادت سے چار سال پیشتر ہفتم ذی الحجہ 1242ھ کو بمقام تختہ بند (علاقہ سرحد) میں طالبین سلوک کے لیے اذکار و مراقبات اور شجراتِ سلاسل کا یہ مجموعہ مرتب کیا تھا۔ سید صاحب کے مجموعۂ ملفوظات صراط مستقیم میں جو اذکار و مراقبات مذکور ہیں، وہی اذکار و مراقبات اس رسالہ میں مختصر مگر جامع انداز میں دیے گئے ہیں۔ البتہ ایک جزوی خصوصیت یہ ہے کہ سید صاحب نے سلاسل طریقت کے شجرات بھی شامل فرما دیے ہیں۔ اس رسالہ کا اردو ترجمہ سید نفیس الحسینی نے کیا اور پہلی بار سید احمد شہید اکیڈمی لاہور سے ذیقعدہ اکتوبر 1978ء میں شائع ہوا۔

مکاتیب سید احمد شہید: یہ سید صاحب کے مکتوبات کے ایک خطی نسخے کا عکسی ایڈیشن ہے جو پہلی بار نومبر 1975ء میں مکتبہ رشیدیہ لمیٹیڈ لاہور سے شائع ہوا۔ سید صاحب کی تحریک کو سمجھنے کے لیے اس مجموعہ کا مطالعہ اہم ہے۔

تنبیہ الغافلین: یہ رسالہ فارسی میں تھا، پہلے کلکتہ پھر لاہور میں شائع ہوا، اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ محمد عبد الحلیم چشتی کی تحقیق کے مطابق اس رسالہ کی نسبت سید صاحب کی طرف محتاج تحقیق ہے۔

رسالہ در نکاح بیوگاں: یہ رسالہ فارسی میں ہے اور ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ محمد عبد الحلیم چشتی کی تحقیق کے مطابق اس رسالہ کی نسبت سید صاحب کی طرف صحیح نہیں۔

رسالہ در نماز و عبادات: اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک کے ایک مجموعہ میں ہے، ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

صراط مستقیم: یہ سید صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو شاہ محمد اسماعیل دہلوی نے مرتب کیا ہے، ابتدائی دو باب عبد الحی بڈھانوی کے مرتب کردہ ہیں۔ سید صاحب بیان فرماتے، اسے سن کر شاہ اسماعیل دہلوی یا عبد الحی بڈھانوی لکھ کر لے آتے، اگر ان کی عبارت اظہار مدعا کے لیے کفایت نہ کرتی تو فرماتے کہ پھر لکھیے، بعض مطالب کو پانچ پانچ مرتبہ لکھوایا۔ یہ 1233ھ کی تالیف ہے۔

3.3 تحریک مجاہدین (شہیدین)

تحریکِ مجاہدین المعروف تحریک شہیدین جس کی قیادت سید احمد شہید بریلوی نے کی، برصغیر کی اسلامی تاریخ کی ایک منظم، ہمہ جہت تحریک تھی۔ یہ تحریک نہ تو محض وقتی ردِّ عمل تھی اور نہ ہی صرف عسکری بغاوت؛ بلکہ یہ ایک ایسی اسلامی احیائی تحریک تھی جس کے مقاصد اصلاحِ عقیدہ، تطہیرِ معاشرہ، احیائے شریعت اور اسلامی سیاسی بالادستی کی بحالی سے وابستہ تھے۔ اس تحریک کے مقاصد وقت کے ساتھ ساتھ حالات کے مطابق ارتقائی مراحل سے گزرتے رہے، حتیٰ کہ معرکۂ بالاکوٹ پر اس کا عسکری باب اختتام پذیر ہوا۔

پس منظر

اٹھارہویں صدی کے اختتام تک مغلیہ سلطنت اپنی عملی حیثیت کھو چکی تھی اور صرف ایک علامتی اقتدار کی صورت میں باقی رہ گئی تھی۔ دہلی کا بادشاہ محض نام کا فرماں روا تھا، جس کے پاس نہ تو فوجی طاقت تھی اور نہ ہی انتظامی اختیار۔۔ نتیجتاً مرکزی اقتدار تحلیل ہو گیا اور برصغیر مختلف علاقائی اور غیر ملکی قوتوں کے درمیان تقسیم ہو کر رہ گیا۔

اس سیاسی خلا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تین بڑی طاقتیں ابھریں۔ سب سے پہلے انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی، جو ابتدا میں ایک تجارتی ادارے کے طور پر وجود میں آئی تھی، آہستہ آہستہ سیاسی اور عسکری قوت میں تبدیل ہو گئی۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد کمپنی نے اپنا دائرہ کار وسیع کیا اور مقامی حکمرانوں کو باہمی سازشوں اور معاہدات کے ذریعے کمزور کیا۔ انگریز اقتدار اگرچہ ابتدا میں براہِ راست مذہبی جبر پر مبنی نہ تھا، مگر اس نے مسلمانوں کی سیاسی بالادستی کو مکمل طور پر ختم کر دیا اور اسلامی ریاستی ڈھانچے کو منہدم کر دیا۔

دوسری اہم طاقت مرہٹہ تھی، جو مغلیہ کمزوری کے بعد وسطی اور شمالی ہندوستان میں ایک فیصلہ کن سیاسی قوت کے طور پر ابھری۔ مرہٹوں نے دہلی تک قبضہ جما لیا اور مغل بادشاہ کو اپنی سرپرستی میں لے کر اس کی حیثیت محض ایک مہرے تک محدود کر دی۔ اگرچہ مرہٹہ اقتدار نسبتاً مختصر رہا، لیکن اس نے بھی مسلمانوں کے سیاسی اعتماد اور اجتماعی قوت کو سخت نقصان پہنچایا۔

تیسری اور نہایت اہم طاقت سکھ حکومت تھی، جو خصوصاً پنجاب اور سرحدی علاقوں میں قائم ہوئی۔ سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں سکھ ریاست ایک مضبوط، منظم اور عسکری لحاظ سے مستحکم قوت بن چکی تھی۔ پنجاب کے وہ علاقے جو صدیوں تک اسلامی تہذیب اور مسلم سیاسی اقتدار کا مرکز رہے تھے، اب ایک غیر مسلم ریاست کے زیرِ اقتدار آ چکے تھے۔

سکھ حکومت کے تحت مسلمانوں کو شدید مذہبی اور سماجی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ متعدد تاریخی مصادر اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ سکھ اقتدار میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اذان دینے پر پابندیاں عائد تھیں، کئی علاقوں میں مساجد کو بند کر دیا گیا یا انہیں اصطبلوں، گوداموں اور سرکاری عمارتوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے مذہبی تعلیم، اجتماعی عبادات اور اسلامی قوانین پر عمل مشکل بلکہ بعض مقامات پر ناممکن بنا دیا گیا۔

یہ صورتحال محض سیاسی غلامی تک محدود نہ تھی بلکہ ایک مذہبی جبر کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اسلامی فقہ کی روشنی میں جب کسی

خطے میں مسلمان اپنے دین کے بنیادی شعائر آزادانہ طور پر ادا نہ کر سکیں، تو وہ علاقہ دارالاسلام کے زمرے سے نکل کر دارالحرب یا کم از کم دارالکفر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ سکھ اقتدار کے زیرِ اثر علاقوں میں یہی کیفیت پیدا ہو چکی تھی، جس نے علماء اور دینی قائدین کو اس صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کیا۔

اسی تناظر میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا، جو اس بات کا فکری اور فقہی اعلان تھا کہ اب مسلمانوں پر محض اصلاحِ نفس ہی نہیں بلکہ اجتماعی جدوجہد بھی لازم ہو چکی ہے۔ یہی فکری پس منظر آگے چل کر سید احمد شہید بریلوی کی تحریکِ مجاہدین کی بنیاد بنا، جس کا مقصد سیاسی اقتدار حاصل کرنا نہیں بلکہ اسلامی شعائر کی بحالی، مذہبی آزادی کا تحفظ اور اسلامی نظامِ حیات کا احیا تھا۔

یوں اٹھارہویں صدی کے اختتام تک برصغیر کی سیاسی اور مذہبی صورتِ حال اس نہج پر پہنچ چکی تھی جہاں اصلاح، ہجرت اور جہاد جیسے تصورات محض نظری مباحث نہ رہے بلکہ عملی تقاضوں کی صورت اختیار کر گئے۔ یہ وہ تاریخی پس منظر تھا جس میں تحریکِ مجاہدین نے جنم لیا اور جس نے سید احمد شہید بریلوی کو عملی جدوجہد پر آمادہ کیا۔

3.3.1 مقاصد

کسی بھی تحریک کی تخم ریزی ایک پس منظر کے تحت ہوتی ہے اور اس تحریک کی نشو نما ایک نظریہ ایک مقصد کے تحت ہوتی ہے۔ آیئے اس دور کے پس منظر کو جاننے کے بعد ہم یہاں پر اس جدوجہد کی ضرورت اور اس کے وہ اسباب محرکات جس نے اس تحریک کو مہمیز کیا اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تحریکِ مجاہدین کے مقاصد کو درج ذیل بنیادی دائروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اصلاحِ عقیدہ اور احیائے توحید: تحریک کا اولین اور بنیادی مقصد مسلمانوں کے عقیدے کی اصلاح تھا۔ اس دور میں مسلمان معاشرہ بدعات، غیر اسلامی رسومات اور اعتقادی انحرافات کا شکار ہو چکا تھا۔ سید احمد شہید کا مقصد خالص توحید کا فروغ، شرک اور بدعات کا خاتمہ، دین کو رسوم سے پاک کر کے کتاب و سنت کی بنیاد پر استوار کرنا تھا۔ یہ اصلاحی مقصد تحریک کے ہر مرحلے میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

سنتِ نبوی ﷺ کی عملی پیروی: تحریکِ مجاہدین کا دوسرا بڑا مقصد سنتِ رسول ﷺ کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرنا تھا۔ اس میں عبادات میں سنت کی پابندی، معاشرت، لباس اور اخلاق میں نبوی اسوہ، اجتماعی نظم میں اسلامی اقدار، شامل تھے۔ تحریک نے عملی نمونہ پیش کر کے اصلاح کا راستہ اختیار کیا۔

اسلامی شعائر کا تحفظ: سکھ اقتدار کے تحت مسلمانوں کے دینی شعائر پامال ہو رہے تھے۔ چنانچہ تحریک کا ایک اہم مقصد اذان کی آزادی، مساجد کا تحفظ، اسلامی عبادات کی بحالی، تھا۔ یہی مقصد بعد میں عسکری جدوجہد کا سبب بنا۔

سیاسی و دینی آزادی: تحریکِ مجاہدین کا ایک اور واضح ہدف مسلمانوں کو غیر مسلم اقتدار سے نجات دلانا تھا تاکہ وہ آزادانہ طور پر

اسلامی قوانین پر عمل کر سکیں۔ یہ مقصد محض اقتدار کے حصول کے لیے نہیں بلکہ دین کے نفاذ، شریعت کی بالادستی، اسلامی نظمِ حکومت کے قیام کے لیے تھا۔

سید احمد شہید کے زمانے میں صورت حال یہ تھی کہ ہندوستان میں برطانوی راج تھا اور مسلمان ریاستوں کے حکمراں برطانوی حکومت کے وفادار تھے۔ مسلمانوں کا کوئی امام اور خلیفہ نہیں تھا کہ جو جہاد کا اعلان کرتا۔ لہذا فیصلے کا اختیار مسلمان معاشرے کے مختلف طبقوں کو تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے وہ طبقے جنہیں برطانوی اقتدار سے فائدہ تھا انہوں نے اسے دارالسلام قرار دیا اور جنہیں نقصان ہوا تھا وہ اسے دارالحرب شمار کرنے لگے۔ سید احمد اور فرائضی تحریک کے پیروکاروں کے لیے ہندوستان دارالحرب تھا اور اس لیے مسلمانوں کے لیے جہاد لازمی تھا۔ اس ضمن میں سب سے اہم حوالہ ان کے خطوط و مکاتیب ہیں۔ جن کا مطالعہ اور تجزیہ بتاتا ہے کہ بہترے ایسے اسباب تھے جو اس عظیم مہم کے محرک بنے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اپنی کتاب سیرت سید احمد شہید میں سید صاحب کے خطوط کے مکاتیب کے اقتباسات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھے ہیں کہ: ''سید صاحب کی تحریروں اور ذاتی بیانات کے بعد اگرچہ بظاہر اس کی گنجائش نہیں کہ اس کے سوا اور کوئی خیال قائم کیا جائے کہ وہ صاف صاف اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کوشاں اور دین کے ایسے غلبے اور اقتدار اعلی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے، جس میں بے تکلف احکام شرعی کا نفاذ اور حکومت الٰہیہ کا قیام ہو سکے اور ''**حتی یکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ**''(39:8)۔ ترجمہ: یہاں تک کہ شرک کا غلبہ نہ رہنے پائے اور سارا دین اللہ ہی کا ہو جائے کی حقیقت کا ظہور ہو۔

لیکن پچھلے برسوں میں بعض اہل علم کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب جنگ آزادی کے ایک رہنما تھے۔ آپ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے اثر و تسلط اور انگریزی اقتدار کو حقیقی خطرہ سمجھتے تھے اور اس خطرے کے ازالے کے لیے مسلم والیان ریاست اور اہل حکومت و طاقت کو اپنے ساتھ جدجہد کرنے اور تعاون کی دعوت دیتے تھے۔ جو کہ ان کی اعلی سیاسی بصیرت کی دلیل ہے۔''(سیرت سید احمد شہید)

3.3.2 تحریک کا ارتقائی سفر

تحریکِ مجاہدین کا آغاز 1818ء میں ہوا۔ اس کا ارتقا تدریجی اور مرحلہ وار تھا، جو اسے ایک سنجیدہ اور شعوری تحریک کے طور پر پیش کرتا ہے۔

پہلا مرحلہ: انفرادی و اخلاقی اصلاح

اس تحریک کا آغاز عسکری نہیں بلکہ اصلاح معاشرہ کے اقدامات سے ہوا۔ سید احمد شہید نے معاشرے کی اصلاح کو جہاد کی بنیاد قرار دیا۔ چنانچہ تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس مرحلے میں وعظ و نصیحت، بیعت کا نظام، تزکیۂ نفس، اخلاقی تربیت، پر زور دیا گیا۔ اس میں سب سے اول مقصد تصور توحید کو دوبارہ مسلمانوں میں خالص اور اصل شکل میں راسخ کرنے کی مہم کے طور پر شامل تھا۔ اور مقاصد میں یہ بھی

شامل تھا کہ اسلام جن عوامل کی بنا پر کمزور ہو گیا تھا، ان سے اسلامی تعلیمات کو پاک کیا جا سکے۔ ان عوامل میں ہندوانہ رسومات اور جعلی مشرکانہ افکار اور رافضی عقائد خصوصیت سے قابل ذکر تھے۔ سید اسمٰعیل شہید جو اس تحریک کے روح رواں تھے کی شہرۂ آفاق کتاب "تقویۃ الایمان" نے اس مرحلے میں اہم کردار ادا کیا۔ اپنی تحریک کو روشناس کرانے کی غرض سے 1818ء اور 1819ء میں سید صاحب نے سب سے پہلے دوآبہ کے علاقوں کا دورہ کیا اور غازی آباد، مراد نگر، میرٹھ، سدھانہ، کاندھلہ، پھلت، مظفر نگر، دیوبند، گنگوہ، نانوتہ، تھانہ بھون، سہارنپور، روہیل کھنڈ، لکھنؤ اور بریلی گئے۔ 1821ء میں انہوں نے ایک کثیر تعداد کے ساتھ حج کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اس اہم رُکن کا احیا کیا جائے۔ کیوں کہ سمندروں پر یورپی اقوام کے قبضے اور بحری سفر کی مشکلات کی وجہ سے بہت کم ہندوستانی مسلمان حج پر جایا کرتے تھے اور ان حالات کے پیش نظر کچھ علما نے یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ ان حالات میں حج فرض نہیں ہے۔ اس لیے سید احمد شہید نے حج کے اہم رکن کو دوبارہ نافذ کر کے مسلمانوں کی شناخت کو اجاگر کیا۔

دوسرا مرحلہ: اجتماعی تنظیم اور نظم

جب اصلاحِ فرد کا دائرہ وسیع ہوا تو تحریک نے اجتماعی شکل اختیار کی۔ اس مرحلے میں امیر کی اطاعت، نظم وضبط، شرعی قوانین کی پابندی، کو لازمی قرار دیا گیا۔ اس مرحلے پر تحریک ایک منظم جماعت بن چکی تھی۔ اس لیے 1823ء میں حج سے واپسی کے بعد سید احمد شہید نے ایک بار پھر ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور لوگ جوق در جوق بیعت کر کے آپ کی تحریک میں شامل ہوئے۔

تیسرا مرحلہ: ہجرت

اسلامی تاریخ کی روشنی میں سید احمد شہید نے ہجرت کو ناگزیر سمجھا۔ ہجرت کا مقصد ظالمانہ نظام سے علیحدگی، اسلامی ماحول کی تشکیل، آزادانہ جدوجہد تھا۔ یہ ہجرت محض جغرافیائی نہیں بلکہ فکری اور اخلاقی بھی تھی۔ سید احمد شہیدؒ اور سید اسماعیل شہیدؒ نے شمال مغربی سرحدی علاقوں (یعنی موجودہ خیبر پختونخوا کے بعض حصوں) کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، کیونکہ یہ علاقے سکھ حکومت کے براہِ راست کنٹرول سے جزوی طور پر آزاد تھے۔ قبائلی مسلمان فطری طور پر آزادی پسند اور جنگجو تھے، یہاں سے پنجاب میں داخل ہونا نسبتاً آسان تھا۔ یہاں مجاہدین نے عسکری کیمپ بھی قائم کیے۔

چوتھا مرحلہ: جہاد فی سبیل اللہ

جب اصلاح، تنظیم اور ہجرت کے مراحل مکمل ہو گئے، تو تحریک نے جہاد کا راستہ اختیار کیا۔ پنجاب اور سرحد کے علاقوں میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سکھ حکومت کے تحت مسلمانوں کو شدید مذہبی، سماجی اور سیاسی جبر کا سامنا تھا۔ اذان پر پابندی، مساجد کی بے حرمتی، شعائرِ اسلام پر قدغنیں اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تباہی نے اس خطے کو عملی طور پر دارالحرب کی صورت دے دی تھی۔ یہی وہ حالات تھے جس میں اس تحریک نے جہاد کا علم بلند کیا۔ یہ جہاد دفاعی نوعیت کا تھا، اسلامی شعائر کے تحفظ اور ظلم کے خاتمے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس مرحلہ تک پہنچتے پہنچتے تحریک کے عملی اہداف درج ذیل تھے:

سکھ اقتدار کا خاتمہ　　اسلامی نظم کا قیام　　مسلمانوں کی مذہبی آزادی　　شریعت کا نفاذ

سکھ حکومت کو تحریک کی سنجیدگی کا اندازہ ہوا اس مرحلے میں تحریک نے سکھ حکومت کے خلاف عملی مزاحمت کی اور ابتدائی طور پر بعض علاقوں میں یہ اہداف جزوی طور پر حاصل بھی ہوئے، مگر مکمل کامیابی ممکن نہ ہو سکی۔

سید احمد شہید اور ان کے ساتھیوں نے 1825ء میں اپنا سفر شروع کیا، اور راجپوتانہ، مارواڑ، سندھ، بلوچستان اور افغانستان سے ہوتے ہوئے سرحد (خیبر پختونخواہ) کے علاقے میں داخل ہوئے اور یہاں سے انہوں نے رنجیت سنگھ کو یہ پیغام بھیجا کہ: ''یا تو مسلمان ہو جاؤ، جزیہ دو یا جنگ کرو اور یہ یاد رکھو کہ جنگ کی صورت میں افغانستان ہندوستان کے ساتھ ہے''۔

سید احمد کی پہلی جنگ 21 دسمبر 1826ء کو بمقام اکوڑہ ہوئی اور اس میں نہ صرف انہیں کامیابی ہوئی بلکہ مال غنیمت بھی ہاتھ آیا۔ اس کامیابی نے ان کے حوصلے بڑھا دیے اور سرحد کے قبائل میں اس فتح نے ان کے اثر و رسوخ کو بڑھا دیا۔ اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ انتظامات اور دوسرے امور کے لیے باقاعدہ تنظیم ہو تاکہ شریعت کے مطابق باقاعدہ فیصلے کیے جائیں۔ اس کی روشنی میں 11 جنوری 1827ء کو آپ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی اور آپ کو امیر المومنین منتخب کر کے خلیفہ کے خطاب سے پکارا جانے لگا۔

اکوڑہ کے علاوہ تحریکِ مجاہدین کے دیگر معرکے، نوشہرہ اور ہشت نگر کے علاقوں میں پیش آئے۔ ان معرکوں میں سکھ فوج کے مقامی دستوں سے جھڑپیں ہوئیں اور مجاہدین نے محدود وسائل کے باوجود جرأت و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ کئی مقامات پر سکھ افواج کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ان ابتدائی کامیابیوں سے نہ صرف مجاہدین کے حوصلے بلند ہوئے بلکہ تحریک کو عوامی حمایت حاصل ہوئی۔

احیا کی تحریکوں میں ہمیشہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ماضی کے قدیم ڈھانچہ کو دوبارہ تشکیل دیا جائے اور قدیم الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال کیا جائے۔ اس لیے امیر المومنین، خلیفہ، امام، مجلس شوریٰ، اور بیت المال کی اصطلاحات کا استعمال ہوا۔

سید احمد کے دعویٰ امامت نے نہ صرف سرحد میں انکی مخالفت کو ابھارا بلکہ ہندوستان میں بھی ان کے اس دعوے کو شک وشبہ سے دیکھا گیا۔ جب خطبے میں ان کا نام بحیثیت خلیفہ اور امام پڑھا گیا تو سرحد کے سرداروں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ ان کے علاقے میں اپنی حکومت قائم کر کے انہیں اقتدار اور سرداری سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنے خطوط میں جو انہوں نے ہندوستان اور دوسرے مسلمان حکمرانوں کو لکھے اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا مقصد دنیاوی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ کافروں سے جہاد کے لئے امام بننے پر تیار ہوئے ہیں۔

سید احمد کے سیاسی اور مذہبی اقتدار نے سرحد میں ان کے خلاف زبردست مخالفت پیدا کر دی، کیونکہ اچانک سرحد پر آ کر وہاں کے پورے سیاسی ڈھانچے کو بدل ڈالا جس کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھے۔ سرحد کے سرداروں کا اپنا یہ نقطہ نظر تھا کہ وہ سید احمد کی مدد سے سکھوں کو نکال کر اپنی خود مختاری بحال کر لیں گے۔ مگر جب انہوں نے خود کو امام اور خلیفہ منتخب کر لیا تو وہ اس سے مایوس ہو گئے۔ پٹھان سردار اور عوام شمالی ہندوستان سے آنے والے غیروں اور اجنبیوں کو اپنا حکمراں تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ اس لیے اگرچہ ان کے معرکے سکھوں سے رہے، لیکن بہت جلد سکھوں کے ساتھ ساتھ پٹھانوں سے بھی جنگ شروع ہو گئی۔

1830ء کے قریب تحریکِ مجاہدین نے پشاور کے اطراف میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ اس دوران گورنر یار محمد خان اور دیگر مقامی حکمرانوں کی وفاداریاں مشکوک ہوئیں اور بعض قبائلی سردار ذاتی مفادات، خوف اور سکھ دباؤ کے باعث پیچھے ہٹ گئے۔

جہاں ایک طرف مجاہدین سکھ فوج سے نبرد آزما تھے، وہیں دوسری طرف قبائلی اختلافات، مقامی سرداروں کی غداری، اور نظم و ضبط سے انحراف، فکری اختلافات، نے تحریک کو کمزور کر دیا۔ اس موقع پر سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہیدؒ نے سخت اصلاحی موقف اختیار کیا، جس کی وجہ سے بعض قبائل ناراض ہوئے اور تحریک کی عوامی حمایت میں کمی آئی۔ نتیجتاً مجاہدین ایک محدود دائرے میں سمٹنے لگے۔ سکھ فوج کی عسکری برتری، جدید اسلحہ، انگریزوں اور ان کے ماتحت علما و سرداروں کی سیاسی سازشوں جیسے عوامل نے تحریک کی رفتار کو متاثر کیا۔

3.3.3 اختتامی مرحلہ: معرکہ بالاکوٹ

انیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک تحریکِ مجاہدین ایک منظم اصلاحی اور عسکری جدوجہد کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ انہی حالات کے تناظر میں 1831ء میں پیش آنے والا معرکۂ بالاکوٹ تحریکِ مجاہدین کا سب سے اہم اور فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوا۔

جب سکھ حکومت کو یقین ہو گیا کہ تحریکِ مجاہدین ایک مستقل خطرہ بن چکی ہے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک بڑی اور منظم فوج تجربہ کار جرنیلوں کی قیادت میں مجاہدین کے مرکز بالاکوٹ کی طرف روانہ کی۔ بالاکوٹ (موجودہ خیبر پختونخوا) جغرافیائی اعتبار سے ایک اہم مقام تھا، جہاں سید احمد شہید مجاہدین کے ساتھ مقیم تھے۔ یہ علاقہ پہاڑی، دشوار گزار اور دفاعی اعتبار سے موزوں تھا۔

1831ء میں سکھ افواج نے بالاکوٹ پر منظم اور اچانک حملہ کیا۔ مجاہدین نے قلیل وسائل کے باوجود غیر معمولی جرأت اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔ سید احمد شہید خود میدانِ جنگ میں موجود تھے اور مجاہدین کی قیادت کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے مخلص رفیق شاہ اسماعیل شہید بھی شریکِ جہاد تھے۔ جنگ شدید تھی۔ مجاہدین نے ابتدائی مزاحمت ضرور کی، مگر عددی کمی، اسلحے کی قلت اور اچانک حملے نے دفاع کو مشکل بنا دیا۔ بالآخر اس معرکے میں سید احمد شہید بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید سمیت متعدد مجاہدین نے جامِ شہادت نوش کیا۔ یہ معرکہ عسکری لحاظ سے تحریکِ مجاہدین کی شکست پر منتج ہوا، مگر اخلاقی اور فکری اعتبار سے یہ ایک عظیم قربانی کی مثال بن گیا۔

3.4 ناکامی کے اسباب

سید احمد کی تحریک جہاد کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو اس کی بنیادی کمزوریوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سرحد کے علاقے کو اپنا مرکز بنانے سے پہلے نہ تو سید احمد نے اور نہ ان کے پیروکاروں نے اس علاقے کے جغرافیہ کو سمجھا نہ اس کی تاریخ کو۔ اور نہ قبائل کی تشکیل، ان کی روایات و رسومات اور ذہن کو۔ نہ انہوں نے ان کی زبان سیکھی اور نہ ان کے طور طریق۔ نہ انہوں نے اس بات کا ادراک کیا کہ لسانی اور قبائلی رشتے ان کے نزدیک مذہب سے زیادہ مضبوط ہیں۔ نہ اس پر فکر کی کہ کیا وہ شمالی ہندوستان سے آنے والوں کو اپنا حکمران تسلیم کریں گے۔ کیونکہ مذہب ایک سہی، مگر ثقافتی اختلافات نمایاں تھے۔ ان کے ساتھ جو مجاہدین اور رضاکار آئے تھے، ان کی مدد سے قبائل کو شکست دے کر وہاں بزور طاقت حکومت قائم کرنا مشکل تھا۔ اس لیے ان کی سرگرمیوں کو پٹھانوں نے شروع ہی سے شک و شبہ سے دیکھا۔ اس بات

کا احساس سب سے پہلے اسماعیل شہیدؒ کو ہوا جس کو انہوں نے اس طرح بیان کیا:

"اس علاقے میں آکر ایسا معلوم ہوا کہ اگرچہ طویل مدت میں خدا کی مہربانی مقصود کا حصول متوقع ہے۔ لیکن ابھی اس نواح میں لشکر آنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی تو اس کی ضرورت تھی کہ فدوی چند خدمت گاروں کے ساتھ اس نواح میں آتا اور دیہاتوں اور بستیوں کا خفیہ اور اعلانیہ دورہ کرتا۔ جب اس علاقے کے رؤسا تیار ہو جاتے اور لشکر کے قیام کے لیے کوئی جگہ معین ہوتی تو اس وقت لشکر اسلام رونق افروز ہوتا۔ یا ابتدا ہی میں ایک بڑا لشکرِ جرار یہاں کا رخ کرتا اور یہاں کے باشندوں کی موافقت یا مخالفت سے قطع نظر کرتے ہوئے علم جہاد بلند کرتا اور بغیر کسی تردد اور دغدغہ کے کفار و منافقین پر دست اندازی کرتا، پھر جو مخالفت کرتا سزا پاتا"۔

اس کے علاوہ ان کے ساتھ جو لوگ آئے تھے وہ سب دین کی خاطر جہاد کرنے والے نہیں تھے۔ ان میں ایسی تعداد بھی تھی جو محض مال غنیمت کے لیے فوج میں شامل ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ جہاد میں حصہ لینے والوں کی اکثریت کی کوئی فوجی تربیت نہیں ہوئی تھی۔ جس کی بنا پر ان میں نظم و ضبط کی کمی تھی۔ فوجی اخراجات اور اسلحہ کے لیے انہیں ہندوستان کے چندوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ ابتدا میں لوگوں نے خوب چندہ دیا، مگر جب کامیابی کے امکانات کم ہوئے تو اسی طرح سے چندے میں کمی آتی گئی۔

3.4.1 تحریک کا فکری تسلسل اور وراثت

سید احمد شہید کی تحریک سکھوں کے خلاف کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکی اور نہ سرحد میں اسلامی معاشرے کا قیام ممکن ہو سکا۔ جب 1849ء میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے سختی سے اس تحریک کو ختم کر دیا اور ان پر 1870ء تک "وہابی مقدمات" چلائے گئے تحریک سے وابسطہ علماء کو مختلف سزائیں دی گئیں۔ آخر میں مولوی محمد حسین بٹالوی نے انگریزی حکومت سے مصالحت کر لی، اور جہاد کی مخالفت میں ایک رسالہ لکھا۔

سید احمد کی تحریک کی چند خصوصیات یہ تھیں کہ یہ مکمل طور پر ایک ہندوستانی تحریک تھی۔ اور اس کا تعلق باہر سے نہیں تھا اور نہ یہ بیرونی امداد پر چلی۔ اس تحریک کے لیے تمام چندہ ہندوستان ہی سے جمع ہوا کرتا تھا، اس کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمان معاشرے میں علیحدگی کے جذبات پیدا ہوئے اور مغل ثقافت، جو سیکولر ثقافت کے طور پر ابھر رہی تھی، اس تحریک نے اس کے پھیلاؤ اور اس کی ترقی کو روکا۔

اگرچہ تحریک عسکری طور پر ختم ہو گئی، مگر اس کے مقاصد اور افکار زندہ رہے۔ اس کے اثرات بعد کی اصلاحی تحریکوں ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس تحریک کا اثر یہ بھی ہوا کہ اس کے بعد علماء نے جہاد کے بجائے دعوتی مشن شروع کئے اور مدرسے اور درس گاہیں قائم کیں۔

اس تحریک کا ایک منفی اثر یہ ہوا کہ ہندوستانی علماء کے طبقے میں گہرے اختلافات پیدا ہوئے اور یہ اختلافات مناظروں اور وعظوں کی صورت میں اور زیادہ شدید ہوتے چلے گئے۔ کئی علماء کی جماعتوں نے اس تحریک سے قطعی لاتعلقی کا اظہار کیا۔

تحریکِ مجاہدین ایک ہمہ جہت اسلامی احیائی تحریک تھی جس کے مقاصد وقت کے ساتھ ارتقا پذیر ہوئے۔ اصلاحِ عقیدہ سے لے کر جہاد تک، ہر مرحلہ ایک فکری تسلسل کا حصہ تھا۔ معرکۂ بالاکوٹ پر اس تحریک کا عسکری باب بند ہوا، مگر اس کے مقاصد، نظریات اور قربانی نے برصغیر کی اسلامی تاریخ میں ایک دائمی نقش چھوڑا ہے۔

3.5 فرہنگ

دوآبہ : دو دریاؤں کے بیچ کا علاقہ۔

تجدید : احیا(Renewal)

ثقافت : کلچر(Culture)

3.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- سید احمد شہید حسنی حسینی سید خاندان میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے وطن رائے بریلی میں حاصل کی۔ بچپن سے ہی جری اور حربی فنون سے دلچسپی رکھتے تھے۔ سلوک کے منازل شاہ عبدالعزیزؒ کے پاس طے کیے اور اس کے بعد امیر خاں کے پاس فوج میں بھرتی ہوئے۔
- اصلاح معاشرہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے تحریک کی بنیاد رکھی جسے تحریک مجاہدین یا تحریک شہیدین بھی کہا جاتا ہے۔
- سید احمد رائے بریلوی نے ہندوستان میں حکومت الٰہیہ کے قیام اور مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم وستم سے محفوظ کرنے کے لیے جہاد کا آغاز کیا اور تقریباً چار ساڑھے چار سال تک ان سے برسرپیکار رہے۔
- تحریک مجاہدین مختلف اسباب کی بنا پر ناکام ہوگئی جس میں متعدد مواقع پر سکھوں کے خلاف قبائلی سرداروں کی عدم موافقت، پٹھانوں کی غداری، افغان سرداروں کی جاہلانہ عصبیت، افغان علماء کا مسئلہ عشر کی وجہ سے مخالفت کرنا، بعض علماء سوء کی تفریق انگیز حرکات، قاضیوں کے غلط فیصلوں اور کچھ مجاہدین کی ناتجربہ کاری یا ناعاقبت اندیشی شامل ہے۔
- اس تحریک کا سب سے اہم معرکہ بالاکوٹ شمار کیا جاتا ہے جس میں سید احمد اور ان کے معاون سید اسمٰعیل اور ان کے اکثر رفقاء شہید ہوگئے۔ اسی نسبت سے اس تحریک کو تحریک شہیدین بھی کہا جاتا ہے ان کی شہادت کے بعد تحریک کا مکمل طور خاتمہ نہیں ہوا اور ہندوستان کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف پس پردہ متحرک رہی۔

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.7.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. معرکہ بالاکوٹ میں سید احمد شہید کے بالمقابل سکھوں کا سربراہ کون تھا؟

(a).بدھ سنگھ (b).رنجیت سنگھ (c).شیر سنگھ (d).سب غلط

2. سید احمد شہید نے دوآبہ کا سفر کب کیا؟

1810. (a) 1812.(b) 1816.(c) 1818.(d)

3. سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں آپ کے ساتھ کون شامل تھے؟

(a).شاہ سید عبدالقادر (b).شاہ سید اسمٰعیل (c).شاہ عبدالعزیز (d).سب غلط

4. سید احمد شہید نے سلوک کے منازل کس بزرگ کی سرپرستی میں طے کیے؟

(a) .شاہ ولی اللہ دہلوی (b).شاہ عبدالحق دہلوی (c).شاہ عبدالعزیز دہلوی (d).شاہ عبدالرحیم

5. تحریک شہیدین کا سب سے اہم معرکہ کون سا تھا؟

(a).بالاکوٹ (b).بکسر (c).پلاسی (d)سب صحیح

3.7.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. سید احمد رائے بریلوی کی شخصیت کا مختصر تعارف کروایئے۔
2. تحریک شہیدین کی وجہ تسمیہ پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
3. معرکہ بالاکوٹ کی ناکامی کے اسباب کا خلاصہ کیجیے۔
4. تحریک مجاہدین کے ارتقائی سفر پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
5. سید احمد شہید نے سکھوں سے جہاد کا فیصلہ کیوں کیا؟ بیان کیجیے۔

3.7.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. سید احمد رائے بریلوی کے حیات و خدمات پر ایک جامع مضمون قلمبند کیجیے۔
2. تحریک شہیدین کے آغاز و ارتقا کے معاشی اور سیاسی اسباب پر ایک تجزیاتی نوٹ تحریر کیجیے۔
3. تحریک شہیدین کے اسباب زوال پر نوٹ لکھتے ہوئے اس کے اثرات پر روشنی ڈالیے۔

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. المیہ تاریخ : ڈاکٹر مبارک علی
2. تحریکِ جہاد اور برٹش گورنمنٹ : مولانا خوشتر نورانی
3. تحریکِ سید احمد شہید : غلام رسول مہر
4. سیرت سید احمد شہید : مولانا ابوالحسن علی ندوی

معروضی سوالات کے جوابات

1. B	2. C	3. B	4. C	5. A

اکائی 4: سرسید احمد خاں

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 سرسید احمد خاں

4.2.1 حسب ونسب

4.2.2 تعلیم

4.2.3 ملازمت

4.2.4 تحقیقی مزاج

4.2.5 1857ء

4.2.6 مدرسہ کا قیام

4.2.7 اسباب بغاوت ہند

4.2.8 قحط

4.2.9 غازی پور

4.3 علی گڑھ

4.3.1 انسٹی ٹیوٹ گزٹ

4.3.2 مدرسۃ العلوم

4.3.3 انگلینڈ کا سفر

4.3.4 مسلمانوں کی تعلیم

4.3.5 مدرسۃ العلوم کی تکمیل

4.3.6 محمڈن اینگلو اورینٹل کالج
4.3.7 یونیورسٹی کی تجویز
4.3.8 یونیورسٹی کے لیے چندے کی کوشش
4.3.9 کالج کا انتظام تعلیم
4.3.10 سرسید کا انتقال اور کالج کی حالت
4.4 فرہنگ
4.5 اکتسابی نتائج
4.6 نمونہ امتحانی سوالات
4.6.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات
4.6.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات
4.6.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات
4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

سرسید کا شمار ایسے مفکرین میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی فکر و عمل سے ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت بدلنے کا خواب دیکھا اور ان کو پستی سے نکال کر سیدھے راستے پر لا کھڑا کر دیا۔ اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ ہندوستان کو جن قابل فخر شخصیتوں پر ناز ہے ان میں سرسید کا نام سرفہرست ہے۔ آپ نے اپنی زندگی قوم کی بھلائی کے لئے وقف کی۔ آپ کا شمار برصغیر کے عظیم مفکر، مصلح اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ انیسویں صدی میں آپ نے مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور فکری ارتقا کے لئے جو کارنامے انجام دیے وہ ہندوستانی عوام کے لئے مشعل راہ ہیں۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ:

- سرسید احمد خان کے حالاتِ زندگی سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

- ان کے تحقیقی و سائنسی مزاج اور اصلاحی کارناموں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ایم اے او کالج) کے قیام کے لیے ان کی سعی و جدوجہد سے روشناس ہو سکیں۔

4.2 سر سید احمد خاں

4.2.1 حسب و نسب

سر سید کو باپ اور ماں دونوں جانب سے پُر فخر نسب کی نسبت حاصل تھی۔ ان کے والد میر متقی تھے جو مغل بادشاہ اکبر کے بچپن اور جوانی کے دوست تھے، اس لیے اکبر شاہ کے تخت شاہی پر بیٹھنے کے بعد میر متقی کا اثر و رسوخ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ تیراکی اور تیر اندازی میں ماہر تھے، کیوں کہ ان دونوں فنوں کو اس زمانہ میں جوہر شرافت سمجھا جاتا تھا۔ سر سید نے بھی تیراکی اور تیر اندازی ان ہی سے سیکھی۔ ننھیال کا حال خود سر سید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے حالات میں لکھا۔ خواجہ فرید الدین کو خاندان میں سب سے زیادہ لائق و دانش مند سمجھا جاتا تھا۔ ریاضی میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ سر سید کی والدہ خواجہ صاحب کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ اولاد کی تربیت میں ان کو خداداد ملکہ ملا تھا۔ وہ جتنی عقل مند اور سمجھدار تھیں اس سے زیادہ وہ دل کی نیک اور فطرت کی پاک تھیں۔ 17؍اکتوبر 1817ء میں سر سید دلی میں پیدا ہوئے، ان کے ذکر میں ان کی ماں کے کئی واقعات مولانا حالیؔ نے حیات جاوید میں لکھے اور مقصد بھی یہ بتایا کہ ان واقعات سے سر سید کی طبیعت اور مزاج اور فطری خوبیوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ یہ خوبیاں ان کو ان کے خاندان سے بطور میراث حاصل ہوئی تھیں۔

4.2.2 تعلیم

سر سید کی تقریب بسم اللہ وقت کے بڑے بزرگ شاہ غلام علیؒ نے کرائی۔ پھر گھر ہی میں ایک قدیم شریف گھر کی نوکرانی سے انہوں نے قرآن مجید پڑھا، اس کے بعد مکتب میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ریاضی خاندانی علم تھا، اس لیے اس پر خاص توجہ رہی۔ سر سید کو شروع سے آلاتِ رصد جاننے کا شوق پیدا ہوا، اس لیے اس فن کی اہم کتابیں اپنے ماموں سے پڑھ لیں، طب کی تعلیم بھی حاصل کی، یہ سب اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انہوں نے حاصل کر لیا۔ کتابوں کا شوق ایسے ماحول میں کیوں نہ ہوتا، حالیؔ لکھتے ہیں کہ اس وقت دلی میں جو نامور اہل علم تھے، جیسے صہبائیؔ، غالبؔ اور آزردہؔ، سر سید کو ان سے ملنے اور پاس بیٹھنے کا موقع ملا۔

4.2.3 ملازمت

1838ء میں سر سید کے والد کا انتقال ہوا، سر سید قریب بائیس سال کے تھے۔ ان کے والد کو قلعہ سے تنخواہ ملتی تھی، انتقال کے بعد یہ بہت کم رہ گئی۔ مالی دشواریاں شروع ہوئیں تو سر سید کو گورنمنٹ کی ملازمت کا خیال پیدا ہوا۔ یہاں قلعہ اور گورنمنٹ دونوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے یعنی بادشاہ کا عمل دخل صرف قلعہ تک تھا، باقی ملک کے انتظامی امور پر انگریزوں کا غلبہ ہو چکا تھا۔ سر سید کے خالو دلی میں گورنمنٹ یعنی انگریز انتظامیہ کے تحت عدالت میں صدرِ امین تھے۔ ان سے سر سید نے کچہری میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چند

مہینوں کی محنت کے بعد ان کو فوجداری کے شعبہ میں سررشتہ دار کا منصب دے دیا گیا۔1839ء میں ایک انگریز آفیسر رابرٹ ہملٹن (Robert Hamilton) آگرہ کے کمشنر ہوئے تو انہوں نے سرسید کو اپنے پاس بلا کر نائب منشی کا عہدہ دے دیا۔ یہاں سرسید نے اپنی لیاقت کا بہترین تعارف اس طرح کرایا کہ کمشنری کا پورا دفتر مرتب کر دیا۔ اسی دوران فارسی زبان میں جام جم کے نام سے امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک حال لکھا اور دیوانی کے قوانین کا ایک خلاصہ بھی تیار کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ 1841ء میں وہ مین پوری ضلع کے منصف مقرر کیے گئے۔42ء میں ان کا فتح پور سیکری میں تبادلہ ہو گیا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے تین چھوٹی چھوٹی مذہبی کتابیں لکھیں جن میں جلاء القلوب بذکر المحبوب رسالہ حضورؐ کے حالات میں تھا۔ اسی دوران وہ دلی آئے تو قلعہ میں بہادر شاہ نے ان کو عارف جنگ جواد الدولہ کا شاہی خطاب عطا کیا۔ یہ 1841ء کی بات ہے۔

1846ء میں سرسید کا تبادلہ آگرہ سے دہلی ہو گیا۔ یہاں 1846ء سے 1854ء تک جب تک وہ مستقل صدر امین مقرر نہیں ہوئے تھے، وہ دہلی ہی میں رہے۔ اب سرسید انتیس برس کے ہو گئے۔ یہاں آکر احساس ہوا کہ علوم مشرقیہ جو شروع میں پڑھے اب وہ سب ذہن سے نکل گئے۔ اس احساس نے ان کو پھر سے تفسیر، حدیث، فقہ، ادب عربی کو بہتر طریقہ سے پڑھنے پر آمادہ کیا۔

4.2.4 تحقیقی مزاج

دلی میں منصفی کے زمانہ میں سرسید کے دل میں آیا کہ شہر دہلی کی عمارتوں اور مضافات کی تاریخی جگہوں کی ایک تحقیقی روداد تیار کی جائے۔ یہ کام اس وقت جس قدر دشوار تھا آج اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر عمارتیں کھنڈر بن چکی تھیں۔ کتبات کی عبارتیں پڑھنے کے لائق نہ رہی تھیں۔ بانیوں کے حالات کا بھی علم نہیں تھا۔ عمارتوں کی لمبائی چوڑائی کو ناپنا، یہ ساری تفصیل حیات جاوید میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حالیؔ نے اس وقت سرسید کی کیفیت کو ایک عربی شعر سے واضح کیا، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اس کو آسمان پر کچھ کام ہے"۔

لیکن یہ محض شعری خیال نہیں تھا، سرسید کے اندر کام کرنے کی جو صلاحیتیں پوشیدہ تھیں یہ سب اسی کا ظہور تھا بلکہ بقول حالیؔ: یہ سرسید کی ترقیوں کی گویا پہلی سیڑھی تھی۔

آثار الصنادید سرسید نے جو کچھ جمع کیا اس کو آثار الصنادید کا نام دیا۔1847ء میں یہ چھپ کر شائع ہو گیا، مسٹر رابرٹس اس وقت دہلی کے کلکٹر تھے، وہ انگلینڈ گئے تو وہاں اس کتاب کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا، وہاں اس کو بے حد پسند کیا گیا، یہاں تک کہ اس کے انگریزی ترجمہ کی بات ہوئی۔ اس کو دیکھتے ہوئے سرسید نے آثار الصنادید کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ 1861ء میں اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے کیا، اس کی مقبولیت ہی تھی کہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو اپنا آنریری فیلو بنالیا، اسی دوران سرسید نے کئی اور رسالے مختلف علمی موضوعات پر لکھے۔

1855ء میں سرسید مستقل صدر امین ہو کر بجنور چلے گئے، دو سال بعد 1857ء میں آزادی وطن کی پہلی تحریک سامنے آئی، ظاہر ہے یہ سارا زمانہ کس بے چینی، بے یقینی اور اضطراب کا تھا لیکن ان دو سالوں میں سرسید نے اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ضلع بجنور کی تاریخ

مرتب کی اور اس سے بڑھ کر آئین اکبری کی تصحیح اور تکمیل کی۔ یہ بتاتا ہے کہ سرسید کس عزم اور کس آہنی عمل کے انسان تھے، وہ رکنا اور تھکنا جانتے ہی نہیں تھے، اسی لیے وہ تاریخ میں سرسید بن کر انفرادی شان پر فائز ہوئے۔

4.2.5 1857ء

1857ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ ناقابل فراموش رہے گا۔ اس نے ملک کی قسمت کا فیصلہ ہی نہیں کیا، قوموں کی بربادی اور پھر بیداری کا گواہ بھی بن گیا۔ انقلاب صرف ملک کی سیاسی تاریخ ہی میں نہیں آیا، افراد کی زندگیاں بھی اس انقلاب کے اثر سے کچھ سے کچھ ہو گئیں۔

10ر مئی 1857ء کو دلی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی۔ 12ر مئی کو بجنور میں اس کا اثر ظاہر ہوا، اس وقت سرسید نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے کئی یوروپین لوگوں کو بچانے میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے جس دلیری اور جوانمردی سے انگریزوں کی جان بچائی، اس کی داستان بہت طویل ہے لیکن پڑھنے کے لائق ہے۔ انگریزوں کی سیاست اور ہندوستانیوں میں اختلافات پیدا کر کے ان کو غلام بنا لینے کی چاہت کا بنیادی مطالعہ کرنا ہو تو بجنور کی سرکشی یا بغاوت بہت کچھ سنا جاتی ہے۔

بہر حال سرسید حالات کو دیکھ کر نہایت خلوص سے ہندوستانیوں کے نقصانات کو کم کرنے کے لیے کوشاں رہے، حیات جاوید نے لکھا کہ سرسید ہی کی رائے کا یہ نتیجہ تھا کہ امن ہو جانے کے بعد ضلع کے عام باشندوں سے بہت کم مواخذہ کیا گیا۔

سرسید کو ان کی خدمات کا بدلہ کبھی مقصود نہیں تھا، ان کی طبیعت اور فطرت کو جاننے والے یہی کہتے تھے کہ سرسید اپنی خدمت کا انعام یہی سمجھتے تھے کہ ایسے نازک وقت میں ان کی جانب سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جو اخلاق اور شرافت کے خلاف ہو، مگر انگریزی حکومت نے خود سے ان کی خدمات کی قدر کی اور ان کو خلعت و انعام اور دو نسلوں تک کی پنشن سے نوازا۔ اس کے علاوہ ایک بڑے رئیس تھے جو باغی ہو گئے تھے، ان کی بڑی جائداد سرسید کے حوالے کرنا چاہا مگر سرسید نے یہ سوچ کر اس کو قبول نہیں کیا کہ "مجھ سے زیادہ کوئی نالائق نہ ہو گا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں"۔ سرسید کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس قسم کے واقعات کا گہرائی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اپریل 1858ء میں سرسید مرادآباد کے صدر الصدور بنائے گئے۔ غدر کے بعد اس ضلع میں بھی ہندوستانیوں کی جائیدادیں بڑے پیمانہ پر ضبط کی جانے لگی تھیں۔ سرسید کی وجہ سے ایسی جائیدادیں جتنی مرادآباد میں واگذاشت اور بحال ہوئیں ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئیں۔

4.2.6 مدرسہ کا قیام

مرادآباد میں سرسید نے تاریخ سرکشی بجنور شائع کی۔ یہ کتاب آج بھی بحث کا موضوع ہے لیکن حالیؔ نے ایمانداری سے لکھا کہ واقعات کے بیان کرنے میں سرسید نے مذہبی یا قومی تعصبات کو مطلق دخل نہیں دیا۔

مرادآباد ہی کے قیام میں 1859ء میں سرسید نے ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ اس سے پہلے وہاں کوئی مدرسہ نہ تھا۔ مدرسہ کا یہ قیام سرسید کی زندگی کا ایک موڑ سمجھنا چاہیے۔ مغلیہ حکومت کے خاتمہ اور انگریزوں کے مکمل قبضہ اور حکومت قائم ہونے کے بعد سرسید کی فکر اور سوچ نے یہ نیا موڑ لیا کہ اب عزت سے زندہ رہنا ہے تو تعلیم پر ساری توجہ مرکوز کرنا پڑے گی۔ اسی مرادآباد کے قیام میں انہوں نے گورنمنٹ کے ورناکیولر اسکولوں کے نظام پر سخت اعتراض کرتے ہوئے گورنمنٹ کو مشورے بھی دیے۔ انہوں نے جو اعتراض کیے وہ آج بھی بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ انہوں نے لکھا کہ "گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ہم اسی قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو منحصر ہے صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر، یہ نہایت بے جا ہے"۔ اس مضمون میں سر سید نے دیسی زبانوں کی جگہ ذریعہ تعلیم انگریزی بنائے جانے کی بات ضرور کی مگر وجہ یہی تھی کہ اس وقت تک دیسی زبانیں علمی ترقی کے لیے تیار نہیں تھیں۔

4.2.7 اسباب بغاوت ہند

مرادآباد ہی کے زمانہ قیام میں انہوں نے اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں ہندوستانیوں کو اور خصوصاً مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری ثابت کیا۔ جو اسباب انگریزوں کے ذہن میں سما گئے تھے ان کی تردید کی اور ان کو غلط بتایا۔ یہ رسالہ 1859ء میں چھپ گیا۔ ان کے ایک دوست رائے شنکر داس نے کہا کہ یہ کتاب جتنی بھی چھپی ہے سب جلا دو اور اپنی جان کو خطروں میں نہ ڈالو کہ انگریز تم سے ناراض ہو جائے گا۔ سرسید نے کہا کہ ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود حکومت کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ اگر ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو، مجھ کو نقصان بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔ رائے شنکر داس یہ سن کر آبدیدہ ہو گئے اور پھر خاموش ہو گئے۔ یہ کتاب جب حکومت کے ایوان تک پہنچی تو گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اسے خیر خواہی پر محمول کیا مگر برطانیہ کے فارن سکریٹری مسٹر ہیڈن نے اس کے خلاف سخت تقریر کی اور کہا کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسب ضابطہ بازپرس ہونی چاہیے اور جواب طلب کرنا چاہیے اور پھر سخت سزا دینا چاہیے۔ مگر چونکہ اس رائے کے ہمنوا کم تھے اس لیے سرسید سزا سے بچ گئے۔ اس کتاب کے کئی ترجمے بھی ہوئے مگر سب سے اچھا ترجمہ 1873ء میں سرسید کے دوست کرنل گریہم نے شائع کر دیا۔

مرادآباد ہی میں انہوں نے لائل محمڈنز آف انڈیا کے نام سے کچھ رسالے شائع کرنا شروع کیے جن کا مقصد گورنمنٹ کے ذہن کی صفائی تھی۔

4.2.8 قحط

1860ء میں مرادآباد قحط کی زد میں آ گیا۔ اس کے انتظام کے لیے مرادآباد کے کلکٹر مسٹر اسٹریچی نے سرسید کا انتخاب کیا۔ سرسید نے جس سلیقہ سے اس موقع پر انسانی ہمدردی کا اظہار کیا وہ نہایت غیر معمولی ثابت ہوا۔ چودہ ہزار ضرورت مندوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم کر دیا جاتا، بیماروں کے لیے شفاخانے ہر وقت تیار، بیماروں کو پرہیزی کھانا، مسلمانوں کے لیے مسلمان باورچی اور ہندوؤں کے لیے ہندو باورچیوں کا انتظام، غرض عام آدمی کو ایک ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی اور کمال یہ ہے کہ ایسے اچھے انتظام میں سب سے کم روپیہ مرادآباد

ہی میں خرچ ہوا۔ بعد میں اعتراف کیا گیا کہ سر سید کو جو عزت اور نیک نامی تمام ہندوستان میں حاصل ہوئی یہ اسی بھلائی اور نیکی کا ثمرہ ہے جو قحط کے انتظام میں ان سے ظاہر ہوئی۔ اس قحط کے نتیجے میں بہت سے بچے یتیم ہوئے۔ ان کی دیکھ بھال میں سر سید نے جو رویہ اختیار کیا اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں مگر اس کو اصل کتابوں میں ضرور دیکھنا چاہیے کہ سر سید کے دل میں یہ ارادہ پکا ہو گیا کہ جب بھی موقع ملے گا تمام ہندو مسلمانوں سے چندہ کر کے کسی بڑے شہر میں ایک بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے گا۔ ان یتیموں کو دیکھ کر یہ یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہو گی ان خرابیوں کا مکمل خاتمہ بھی نہیں ہو سکتا۔

سر سید ایک طرف تو ان انتظامی امور کے لیے خود کو وقف کیے ہوئے تھے دوسری طرف وہ علمی کاموں سے بھی الگ نہیں تھے۔ مراد آباد ہی میں انہوں نے تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی، 1862ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس کو شائع کیا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے اسلام اور مسیحیت کے موضوع پر تبیین الکلام جیسی بے نظیر کتاب لکھنے کی شروعات کی۔

اہلیہ کا انتقال

مراد آباد ہی میں 1861ء میں سر سید کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سر سید کی عمر چوالیس برس کی تھی، جسم توانا و تندرست تھا۔ سید حامد اور سید محمود اور ایک بیٹی سب کمسن اولاد تھے۔ دوستوں نے نکاح ثانی کا مشورہ دیا لیکن سر سید نے فیصلہ کر لیا کہ اب عمر کا سارا سرمایہ قومی خدمات ہی کے لیے وقف ہو گیا۔

4.2.9 غازی پور

1862ء میں سر سید کا تبادلہ مراد آباد سے غازی پور ہو گیا۔ یہاں آنے کے بعد ان کے دل میں صرف ایک خیال ہی رہ گیا کہ جب تک ہندوستان میں علم کی روشنی نہ پھیلے گی اس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی ساری تدبیریں فضول اور بیکار ہیں۔ اس کے لیے سر سید نے سب سے پہلے اس کام کو ضروری قرار دیا کہ علوم جدیدہ کی کتابوں کو دیسی زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ اس غرض سے انہوں نے غازی پور میں 1864ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔

اسی سال انہوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کر دیا، یہ مدرسہ قومی چندہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا، اس کے مقاصد میں اس کو بڑا کالج بنانا تھا، راجہ ہر دیو نارائن سنگھ اس کے سرپرست بنائے گئے۔ انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا مگر غازی پور اور اس مدرسہ کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا، اسی سال 1864ء میں سر سید کا تبادلہ علی گڑھ کے لیے ہو گیا اور یہ مدرسہ جو اگر سر سید چند سال اور وہاں رہ جاتے تو ممکن ہے کہ یہ مدرسۃ العلوم یا مسلم یونیورسٹی پر سبقت لے گیا ہوتا۔

4.3 علی گڑھ

1864ء میں سر سید علی گڑھ آ گئے۔ وہ علی گڑھ جس کی عزت اور شہرت خدا نے سر سید کی ذات سے وابستہ کی تھی۔ سر سید کے ساتھ سائنٹفک سوسائٹی کا تمام عملہ بھی غازی پور سے علی گڑھ آ گیا، یہاں سوسائٹی کو بڑی ترقی ملی، عالیشان عمارت بن گئی۔ 1866ء میں اس کا

افتتاح میرٹھ کے کمشنر مسٹر ولیمس نے کیا، چند برسوں میں اس سوسائٹی نے بہت سی مفید کتابیں انگریزی سے ترجمہ کرکے شائع کیں۔

1865ء میں سرسید نے سوسائٹی کی جانب سے کاشتکاری کے موضوع پر کتابیں تالیف کرنے کا منصوبہ بنایا اور خود ہی یہ کام اپنے سر لیا، اس کے لیے انہوں نے مضامین کی ایک لمبی فہرست بھی تیار کرلی مگر یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

4.3.1 انسٹی ٹیوٹ گزٹ

1866ء میں انہوں نے ہندوستانیوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی سہولت کی بات اٹھائی اور اس کے لیے علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ 1866ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کی جانب سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نام کا اخبار جاری کیا۔ اس اخبار نے بڑی شہرت پائی۔ اس میں زیادہ آرٹیکل سرسید کے قلم سے ہوتے۔ شروع میں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں پیش کرکے دونوں قوموں میں اتحاد چاہتے تھے، سیاسی اور سماجی موضوعات سے زیادہ تعلیمی موضوع پر آرٹیکل ہوتے۔ اس اخبار کے متعلق حیات جاوید سے اور کئی تفصیلات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

1867ء میں سرسید جج کا عہدہ پاکر علی گڑھ سے بنارس آگئے۔ یہاں وہ 1876ء تک رہے، یہاں انہوں نے ورناکیولر یونیورسٹی کے قیام کے لیے کوششیں کیں۔ یہی نہیں 1867ء میں انہوں نے ہومیوپیتھک علاج کی حمایت کرنے اور اس کے رواج کو عام کرنے کا ارادہ کیا۔ مہاراجہ بنارس کی صدارت میں انہوں نے بنارس میں ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل کھولا اور مسلسل لوگوں کو اس جانب توجہ دلاتے رہے۔

4.3.2 مدرسۃ العلوم

مسلم یونیورسٹی کے ذکر میں سرسید کی یہ تمام کوششیں بظاہر غیر متعلق سی لگتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی یا اس کے نقش اول مدرسۃ العلوم کے قیام کو سمجھنے کے لیے اس سرسید کو سمجھنا بہت ضروری ہے جس نے ہندوستانیوں کو انگریزوں کی حکومت اور اقتدار کے سایہ میں عزت کے ساتھ جینا سکھانا چاہا تھا۔ وہ ہر روز محکوم ہندوستانیوں کے احساس کمتری یا غلامی کو دور کرنے کے لیے مسلسل سماجی خدمات کے لیے خود کو وقف کرتے رہے۔ 1857ء کے بعد ان کا یہ خیال عقیدہ میں بدل گیا تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور انگریزوں کے ساتھ میل جول نہ ہوگا اس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہوگا۔ اس خواہش کے ساتھ ایک اور خیال یہ تھا کہ سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کا جواب لکھنے کے لیے بہت سی کتابوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں ناپید تھیں، ان کو حاصل کرنے کے لیے انگلستان جانا ضروری تھا، چنانچہ 1869ء میں وہ بنارس سے انگلینڈ کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں وہ سترہ مہینے رہے، اس پوری مدت میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ ان کے سفر نامہ میں دیکھا جاسکتا ہے اور خاص طور پر قوم کی خیر خواہی اور مفید تعلیم پر قوم کی بے حسی کا ذکر جگہ جگہ ہے۔

4.3.3 انگلینڈ کا سفر

انگلینڈ میں ان کی بڑی عزت افزائی ہوئی۔ 1869ء میں ان کو سی، ایس، آئی کا خطاب اور تمغہ ملا، یہ انگلینڈ کا بڑا سرکاری اعزاز تھا، ان کو اور بھی اعزاز ملتے رہے لیکن سرسید کے ذہن اور دل میں جو سودا سمایا تھا وہ تعلیم کا تھا، انگلینڈ میں بھی انہوں نے انگریزوں کی تعلیم و ترقی کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا اور ہندوستان میں اپنے اخبار کے لیے اردو میں بھی ایک مضمون اسی عنوان سے بھیجا، عام طور پر ہندوستان میں لوگ اس سے ناراض ہوئے، مولانا حالیؔ کے قول کے مطابق "یہ سب در حقیقت تمہیدیں تھیں ان کارروائیوں کی جو آخر کار ہندوستان پہنچ کر سرسید کے ہاتھ سے ظہور میں آنے والی تھیں"۔ انگلینڈ کے اس قیام میں انہوں نے اپنی مشہور ترین تالیف خطبات احمدیہ بھی وہیں پوری کی۔

4.3.4 مسلمانوں کی تعلیم

1870ء میں سرسید ہندوستان واپس آ گئے۔ بنارس میں اپنے عہدہ کا چارج لیا، یہاں آتے ہی انہوں نے اس بڑے کام کی بنیاد ڈالنا شروع کی جس کے لیے وہ انگلستان گئے تھے۔ یہ کام کیا تھا؟ یہ کام مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ تھا، وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے مذہبی خیالات اور انگریزوں و انگریزی سے ان کی نفرت اور تعلیم کے مفہوم سے ان کی ناواقفیت ان کے اصل مقصد یعنی ایک محمڈن یونیورسٹی کے قیام میں مخالفتوں کا ایک طوفان کھڑا کر دیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ جو ہندوستان میں اور یونیورسٹیاں ہیں ان کے نظام تعلیم سے حقیقی لیاقت نہیں پیدا ہو سکے گی۔ اس بات کو مسلمانوں، عام ہندوستانیوں اور خود انگریزی حکومت کے کانوں تک پہنچانا ضروری تھا، اس لیے انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کے مزاج کو بدلنے کے لیے رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ جاننے کے لیے اپنے وقت کا یہ مشہور ترین رسالہ آج بھی سب سے زیادہ کار آمد ہے۔ 1870ء میں اس کا پہلا شمارہ نکلا، یہ پرچہ چونکہ ایک بالکل نئے انداز میں مذہب و اخلاق اور تعلیم اور معاشرتی اصلاح کی تبلیغ کرنے والا تھا، اس لیے اس کی مخالفت شد و مد سے ہوئی۔ کفر کے فتوے سرسید اور ان کے ساتھیوں پر لگائے گئے، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی آواز زمانہ کی گونج کے موافق تھی، اس لیے اس کی مقبولیت بھی بڑھتی گئی۔ ایک تو سرسید اور سید مہدی علی خان کی دلکش تحریریں، دوسرے اس کے مضامین کا نرم اور سنجیدہ اسلوب اور اس کا یہ انداز کہ جو بات سچ معلوم ہو وہ لوگوں تک پہنچا دی جائے، زبردستی اس کو منوانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس پرچہ نے مدرسۃ العلوم کے سرسید کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ مدرسۃ العلوم کے سلسلہ میں ہر کوشش اسی رسالہ کے ذریعہ لوگوں کو ملتی رہی، حالیؔ کے بقول "سرسید کی کوششوں کے عملی نتائج اس کے ذریعہ سے دریافت ہوتے تھے اور اس لیے روز بروز مدرسۃ العلوم کی عظمت کا خیال لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا گیا۔

4.3.5 مدرسۃ العلوم کی تکمیل

1876 میں سرسید پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے اور یہیں سے ان کو مدرسۃ العلوم کی تکمیل، اس کی عمارتیں تعمیر کرنے اور ہر طرح سے کالج کی زمین کو آباد و سرسبز کرنے کی طرف پوری طرح توجہ کرنے کی فرصت ملی۔

سرسید کے بنارس کے زمانۂ قیام کی دیگر تفصیلات میں مثلاً کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کا قائم کیا جانا، اسی طرح مدرسۃ العلوم

کے مجوزہ قیام کے لیے ایک کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کی تشکیل کیا جانا اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر ہنٹر کی ایک کتاب اور انڈین مسلمز پر ایک طویل ریویو کے ذریعہ اس کتاب کی غلط بیانیوں کو واضح کرنا تھا۔ اس ریویو سے سرسید کی عظمت انگریز حکام کی نگاہوں میں بہت بڑھ گئی۔ سرسید کی سوانح حیات میں اس کتاب کا عمل اور رد عمل کا مطالعہ بہت اہم ہے لیکن یہاں یہ ہمارے موضوع سے الگ ہے۔ موضوع تو مسلم یونیورسٹی کے نقش اول مدرسۃ العلوم کی تاریخ کو جاننا ہے۔

فروری 1873ء میں بنارس کے ایک جلسہ میں سید محمود نے اس مدرسہ کے باقاعدہ قیام کی تحریک کی، چنانچہ 1873ء ہی میں علی گڑھ میں ایک جلسہ ہوا، پھر کئی اور جلسے ہوئے اور آخر کار 24 مئی 1875ء جو کہ ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کا دن تھا، اس مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ مقرر ہوئی۔ سرسید بنارس سے آئے اور باقاعدہ یکم جون 1875ء سے اس میں تعلیم شروع ہو گئی۔

اب جہاں مسلم یونیورسٹی کی دنیا آباد ہے، یہ خطہ چھاؤنی تھا اور فوج کی پریڈ ہوا کرتی تھی، سرسید نے اس زمین کو حاصل کرنے کے لیے درخواست دے دی، یہ قریب 74؍ ایکڑ کی زمین تھی لیکن انگریز حکام اس درخواست کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، یہاں تک کہ سرسید اور ان کے رفقا مایوس ہونے لگے، مگر یہ خوش قسمتی تھی کہ عین اسی مایوسی کے عالم میں سر جان اسٹریچی، لیفٹنٹ گورنر ہو گئے، ان کو سرسید سے پہلے سے تعلق تھا، انہوں نے خود آکر زمین کا معائنہ کرنے کے بعد چند شرطوں کے ساتھ زمین دینے پر تیار ہو گئے اور اس طرح حسب ضابطہ اس قطعۂ زمین پر قبضہ دلا دیا گیا، ابتدائی مدرسہ اسی سرزمین پر قائم ہو گیا۔

سرسید بنارس سے 1876ء میں ملازمت سے پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے تو مدرسۃ العلوم کی زمین اور وہاں مدرسہ کے ابتدائی درجات شروع ہو چکے تھے۔ سرسید مستقل طور پر آئے تو علی گڑھ ضلع کے تمام رئیسوں اور سربرآوردہ لوگوں نے ان کے اعزاز میں جلسہ کیا۔ ان کو سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس سپاس نامہ کے شکریہ کے طور پر سرسید نے کہا کہ دلی میرا وطن ہے، وہاں بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں دفن ہیں اور بہت سے عزیز اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ خیال یہی ہوا کہ جہاں کی مٹی سے بنا ہوں میری خاک پھر اسی میں مل جائے، لیکن اس وطن کو صرف مدرسۃ العلوم کی محبت اور اپنی قوم کی بھلائی کی وجہ سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ اسی تقریر میں سرسید نے بڑے جذباتی انداز میں کہا اور یہ آج بھی اس لیے نقل کرنے کے لائق ہے کہ معلوم ہو کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے پیچھے جذبات کیا تھے؟ سرسید نے کہا کہ میں نے جب بھی کوئی عمدہ چیز دیکھی، عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، علمی مجلسیں دیکھیں، عمدہ مکانات دیکھے، عمدہ پھول دیکھے، کھیل کود اور عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔ مسلم یونیورسٹی کے آغاز اور اس کی ابتدا کو جاننے اور سمجھنے کے لیے سرسید کے یہ الفاظ ہمیشہ زندہ رکھے جانے کے لائق ہیں کہ مسلم یونیورسٹی قومی ترقی کے لیے قائم کی جانے والی تعلیم کی دنیا ہے۔

4.3.6 محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

سرسید علی گڑھ میں ہمیشہ کی طرح ہمہ تن اپنے مشن میں مصروف ہوگئے۔ مدرسۃ العلوم کی عمارتوں میں تیزی سے ترقی شروع ہوئی۔ پورے ہندوستان میں چندہ کے لیے کوششیں تیز تر ہونے لگیں اور پھر یہ ہوا کہ علی گڑھ صرف مدرسۃ العلوم یا دارالعلوم ہی نہیں رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی اتحاد، قومی مصالح اور قومی مقاصد کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب مدرسۃ العلوم، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قالب میں بدلنے کے لیے تیار ہوا۔ 8 جنوری 1877ء کو لارڈ لٹن نے کالج کا سنگ بنیاد غیر معمولی اور غیر متوقع شان وشوکت کے ساتھ رکھا۔

4.3.7 یونیورسٹی کی تجویز

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ سرسید کے فرزند سید محمود نے ایک اسکیم 10؍فروری 1873ء میں پیش کی تھی اور اس میں اس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنا ہے، کمیٹی نے جو انگریزی نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی رکھا ہے اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی ہونا چاہیے اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دارالعلوم نام رکھنا چاہیے اور گورنمنٹ صرف نگرانِ حال رہے، اس کی اور کسی قسم کی مداخلت اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہیے۔ اس اسکیم کی جو کاپی گورنمنٹ کو بھیجی گئی اس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ موجود تھا لیکن گورنمنٹ کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو حکومت اس کو گرانٹ نہیں دے گی۔ سرسید کا تب یہ کہنا تھا کہ اگر مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ان کی ضرورتوں کے موافق اپنے طور پر تعلیم کا نظم نہیں کیا جائے گا تو بچوں میں اصل لیاقت پیدا نہیں ہوسکے گی۔ اسی لیے ایک مرحلہ یہ بھی آیا کہ سرسید حکومت سے بے نیاز ہوکر یونیورسٹی کے لیے تیار ہوگئے لیکن اس صورت میں یونیورسٹی چلانا اور اس کی ڈگریوں کا پھر بھی حکومت میں نہ تسلیم کیا جانا ایسی باتیں تھیں جن سے بقول مولانا حالیؔ "سرسید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہوگئی"، اس وقت یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال انہوں نے چھوڑ دیا اور مدرسۃ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیوں کا تجویز کردہ ہے، یعنی وقتی طور پر عالم یہ تھا کہ اگر آسمان تک پرواز کی طاقت نہیں تو اتنا ہی اڑیں جہاں تک رسائی ہوسکے، وقتی طور پر یونیورسٹی سے مایوس ضرور ہوئے لیکن مدرسۃ العلوم کے لیے انہوں نے عزم کرلیا کہ اس کو قائم رہنا ہے اور قائم رہنے کے لیے قوم سے چندہ کرنا ہے۔ لکھا گیا کہ یہ سب سے زیادہ مشکل کام تھا، عام مسلمان تو سرسید کے مذہبی اور قومی خیالات سے یوں ہی بدگمان تھے، علما اور دانشور بھی ان کے خلاف فتووں اور مضامین کا انبار لگا رہے تھے۔ سرسید جب تک سرکاری عہدوں پر تھے چندہ لینا آسان تھا، اب عہدے نہیں رہے تو چندہ دینے والے بھی محدود ہوگئے، مگر سرسید جس آہنی عزم کے مالک تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیس برس کے عرصہ میں سات آٹھ لاکھ روپے کی عمارت تیار ہوگئی۔ مدرسہ کی آمدنی سے اسی ہزار سالانہ کا خرچ چلنے لگا۔ اس رقم کو ڈیڑھ سو سال پہلے کی قدر سے دیکھا جائے تو یہ اربوں روپے کے برابر تھی، لوگوں کے لیے یہ کسی معجزہ سے کم نہیں تھا مگر حیات جاوید کے مصنف کی نظر میں جب ایک دانش مند، سچا آدمی استقلال اور ہمت سے کام لیتا ہے تو وہ ہر مشکل پر غالب آسکتا ہے۔ سرسید نے جس لیاقت اور ایمانداری سے مدرسۃ العلوم کے کام کو آگے بڑھایا اس کو دیکھ کر مخالف بھی کام کی عظمت کو سمجھنے لگے، سب سے بڑھ کر

قوم کو یہ اطمینان ہوا کہ جس کام کے لیے روپیہ دیا جارہا ہے وہ صحیح طور پر صرف بھی ہوتا ہے۔

مدرسۃ العلوم یا محمڈن کالج کی عمارتیں جس شاندار پیمانہ پر بننا شروع ہوئیں اس سے بھی لوگ متاثر ہوئے۔ کالج کی بڑائی دیکھ کر مسلمانوں کو اپنی عظمت کے بھولے خواب یاد آنے لگے اور دوسری طرف حکام کے دلوں میں بھی کالج کی وقعت بڑھنے لگی۔

4.3.8 یونیورسٹی کے لیے چندے کی کوشش

کالج کی ترقی اور تعمیرات کی یہ داستان بہت دلچسپ ہے۔ سرسید نے کیسے کیسے چندہ کی راہیں ہموار کیں، بے شمار طریقے اور تدبیریں اختیار کرکے وہ کالج کے لیے سرمایہ فراہم کرتے رہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ سرسید نے اپنے مدرسہ یا کالج کی خاطر ہر بات کو اپنے نفس پر گوارا کر لیا تھا، انہوں نے جگہ جگہ جس طرح جلسوں میں لوگوں سے خطاب کیا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے مگر ایسا حصہ ہے جس کو بار بار دیکھنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے، ایک جلسہ میں کہا کہ فرض کرو کہ میں ایک بدعقیدہ ہوں مگر آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر، مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اور خیر خواہ نہ سمجھیں گے۔

سرسید کی عمر ڈھل رہی تھی مگر مدرسہ یا کالج کے چندے کے لیے وہ پورے ملک میں بڑے بڑے سفر کرتے رہے اور کمال یہ ہے کہ ان تمام اسفار کا خرچ وہ اپنی جیب سے پورا کرتے۔ ایک طریقہ یہ نکالا کہ جو لوگ ان کی دعوت کرنا چاہتے تو ان سے دعوت پر خرچ کیا جانے والا روپیہ لے کر کالج میں جمع کرتے اور اس طرح دعوت کی جگہ چندہ ان کو زیادہ خوش کر دیتا۔ ایسے کئی واقعات سرسید کی سوانح میں درج کیے گئے ہیں، ان کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔

بہر حال سرسید نے اپنی عجیب و غریب تدبیروں سے مدرسہ کے لیے سرمایہ جمع کیا، انگلینڈ سے آنے کے بعد وہ اٹھائیس سال زندہ رہے اور یہ تمام مدت صرف اس فکر کی نذر ہوگئی کہ کس طرح روپیہ فراہم ہو اور مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرسۃ العلوم میں کس طرح ہو۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ اس قسم کے صدہا واقعات روزانہ ہی گزرتے تھے۔ ان کو بیان اسی لیے کیا گیا کہ جس قوم میں عام طور پر تعلیم کی قدر نہ ہو، جہاں ہر کام کا مدار شخصیت اور ذاتی اغراض پر ہو، جہاں قومی ترقی اور قومی فلاح کے نتائج سے لوگ بے خبر ہوں، جہاں امیر بے پروا، دولت مند مسرف یا بخیل ہوں، علماء زمانے کی ضرورتوں سے ناواقف اور عوام الناس جاہل اور مفلس ہوں وہاں ایک ایسا کام جس سے تمام قوم کی بھلائی مقصود ہو کوئی شخص نہیں کر سکتا، جب تک کہ وہ سرسید کی طرح اپنے آپ کو اس کام میں فنا نہ کر دے اور جو فائدے وہ اپنی عقل مندی، شہرت، لیاقت، وجاہت، دوستی، کوشش اور محنت سے خود اٹھا سکتا ہے ان سے خود دست بردار ہو کر اس کام پر وقف نہ کر دے۔ یہ سرسید اور ان کی آرزو مسلم یونیورسٹی کو سمجھنے کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل عبارت ہے۔ سرسید مدرسہ کی خاطر اپنے اوپر یہ بھی لازم کیے ہوئے تھے کہ کوئی اور کام یا کوشش ایسے معاملہ میں نہ کی جائے جس کا مدرسہ سے تعلق نہ ہو، یہ فنائیت کی بڑی مثال ہے۔

سرسید نے جس شان سے اور جس شان کی عمارتیں بنوائیں اس کو اس نظر سے بھی دیکھا گیا کہ آئندہ نسلوں کو اپنے قومی انسٹی ٹیوشن کی عظمت و شان دیکھ کر اس کو باقی و قائم رکھنے کا زیادہ خیال ہو۔ اسٹریچی ہال تیار ہوا تو ایک معزز شخص نے کہا کہ جب تک یہ عمارت

قائم ہے مسلمان یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی ایسے کام کر گزرتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہوسکتے۔ مدرسہ یا اب مسلم یونیورسٹی کی ان عمارتوں کو بھی گہرائی سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ سرسید نے آئندہ نسلوں کے فخر کے لیے تمام عمارتوں کے بانیوں، محسنوں، مربیوں اور مددگاروں کے نام بڑے اہتمام سے لکھوادیے، عمارتوں کے طرز تعمیر میں قوم کی تاریخ کے روشن پہلوؤں کو دکھانے کا جو لحاظ رکھا گیا سرسید اوران کی یونیورسٹی دونوں کا مقصد سمجھنے میں دشواری نہیں آتی اور یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ سرسید نے اپنے نام کو کیوں چھپائے رکھا؟ مسلم یونیورسٹی کے گہر ہونے تک مدرسۃ العلوم کے قطرے پر جو گزری اس کا ایک ایک لمحہ آنکھوں میں بسالینے کی دعوت دیتا ہے۔

4.3.9 کالج کا انتظام تعلیم

مدرسۃ العلوم یا محمڈن کالج میں دو ڈپارٹمنٹ تھے، ایک انگریزی شعبہ جس میں یونیورسٹی کا کورس پڑھانا تجویز ہوا تھا، دوسرا اورینٹل شعبہ جس کے لیے ایک کمیٹی تھی، اردو میں علوم جدیدہ اور فارسی، عربی ادب اور علوم قدیمہ پڑھانے کی تجویز تھی۔

1887ء میں کالج میں کلاس قائم ہوگئی، اسی سال محمڈن کالج فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور 1881ء میں بی اے اور ایم اے تک کلاس شامل ہوگئے، 1882ء میں قانون کے لیے کلکتہ یونیورسٹی اور سائنس اور آرٹس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے الٰہ آباد یونیورسٹی سے مدرسۃ العلوم کا الحاق ہوگیا۔

1893ء میں سید محمود نے ایک لکچر میں بتایا کہ مدرسۃ العلوم نے کتنی تیزی سے مسلمان گریجویٹس کی تعداد میں اضافہ کیا۔

1878ء میں سرسید کو وائسرائے لیجلسٹیو کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا۔ ہندوستانیوں میں سرسید وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے کونسل کی ممبری کے زمانہ میں ہندوستان کی بھلائی کے لیے قانون بنایا، چیچک کے ٹیکے اور قاضیوں کے تقرر کا قانون پاس کرایا۔ سرسید کی زندگی کے ان پہلوؤں کا بظاہر ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم کے بنیادی مقصد کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کے ساتھ وہ اپنے ملک و قوم کے لیے ہر مفید اور تعمیری کام کو بھی یکساں اہمیت دیتے تھے۔ خاندانی وقف قانون بھی ایسی ہی کوشش سے اس ممبری کے زمانہ میں ان سے ایجوکیشن کمیشن میں طویل گفتگو کی گئی۔ یہ گفتگو ایسے سوالوں پر مشتمل تھی کہ کیا مغربی علوم کی تعلیم دیسی زبانوں میں انگریزی زبان کی بہ نسبت زیادہ مفید ہوگی؟ یا یہ کہ کس تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کی اختلافی نوعیتوں کو محفوظ رکھا جاسکے؟ یہ سوال بھی سامنے آیا کہ حکومت کو کس کس حد تک ہر قسم میں تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے؟ ایک سوال یہ بھی کیا گیا کہ گرانٹ ان ایڈ کا قاعدہ جو رواج میں ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟ اسکالرشپ کی ضرورت ہے یا اس کو رشوت کے طور پر سمجھا جائے؟ یہ سوال بھی کیا گیا، ساتھ ہی یہ بھی پوچھا گیا کہ حکومت کی تعلیم کیا اس اثر کو پیدا کرنے میں قاصر رہتی ہے کہ مضامین تعلیم بے شمار ہیں اور کسی ایک مضمون میں کافی لیاقت نہیں ہوتی؟ یہ سوال بھی اہم تھا کہ حکومت مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کرسکتی ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں سرسید نے طویل گفتگو کی، یہاں اس کے ذکر سے یہ بتانا کہ مدرسۃ العلوم کو یونیورسٹی بننے کی راہ میں سرسید نے تعلیم کے موضوع پر کس آخری حد تک تیاری کی تھی۔ اسی تیاری میں محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا نام لیا جاسکتا ہے۔ سرسید نے 1883ء میں یہ تنظیم قائم کی

کہ طالب علم انگلینڈ جا کر کس طرح سول سروس کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔

مدرسۃ العلوم یا محمڈن کالج کی حالت جب اطمینان کے قابل ہو گئی تو سر سید کو خیال آیا کہ صرف ایک کالج سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، پورے ملک کے طلبہ کی ضرورتوں کو دیکھنے کے لیے ایک بنیادی ادارہ ہونا چاہیے، چنانچہ 1886ء میں سر سید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ یہاں اس کی کارکردگی کی گنجائش نہیں لیکن اس تنظیم کا یہ مقصد ضرور پورا ہوا کہ مسلمانوں میں عام طور سے تعلیم کا خیال زیادہ ہو گیا۔

اس دوران سر سید کو کے-سی-ایس-آئی اور ڈاکٹر آف لا جیسے اعزاز ملتے رہے۔ محمڈن کالج کی ترقی کے ساتھ انتظامی مسائل بھی بڑھتے گئے، بعض ناخوشگوار حالات بھی پیدا ہوئے، ان میں سب سے شدید صدمہ 1895ء میں پہنچا جس کی تکلیف ان کو اخیر دم تک رہی۔ ان کے دفتر کے ایک ملازم نے بڑا غبن کیا، یہ شخص ہیڈ کلرک تھا، اس نے ایک لاکھ سے زیادہ کی رقم خرد برد کر دی، اس کی وجہ سے کالج کا تعمیراتی کام تو بند ہی ہو گیا، آئندہ چندہ بھی متاثر ہو گیا، وہ شخص تو پکڑا گیا، جیل بھی گیا لیکن سر سید کا جو حال ہوا وہ مولانا حالیؔ کے الفاظ میں یہ تھا کہ گویا اس رنج میں ان کا کام ہی تمام ہو گیا۔

سر سید اپنی تمام خدمات حسب سابق انجام دیتے رہے، کالج کی بہبودی کا خیال ان کے دل سے فراموش نہیں ہوتا تھا، وہ کمزور ہو گئے، بیٹے کی علالت سے وہ خود ٹوٹ سے گئے مگر اسی حالت میں انہوں نے تعلیم کے موضوع پر کئی مضامین لکھے۔ ان کا بھی وقتِ آخر قریب آ گیا تھا، 27 مارچ 1898ء کو انہوں نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔

1898ء کو اگر 1875ء کے پس منظر میں دیکھا جائے تو قابل یقین حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ 1875ء میں جب علی گڑھ میں ابتدائی اسکول کھولا گیا اس وقت کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہو چکی تھیں، اس وقت پورے ہندوستان میں مسلمانوں میں صرف سترہ بی اے اور تین ایم اے تھے، جب کہ برادران وطن میں گریجویشن کرنے والے قریب ایک ہزار تھے۔ ایسے میں اسکول کے کالج ہونے کے بہت کم وقت میں صرف سر سید کے کالج سے قریب تین سو گریجویٹ کامیاب ہو کر نکلے، یہی نہیں محمڈن کالج کا اثر ملک کے دیگر صوبوں میں صاف نظر آنے لگا۔ ساتھ ہی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ محمڈن کالج کے اسکالرشپ، ہاسٹل، اسپورٹس، ڈسپلن، قومی لباس، کالج کے احاطہ میں سوسائٹیاں اور مکتب وغیرہ جیسے شعبوں نے محمڈن کالج کو صرف ایک عام کالج کی جگہ ایک بڑے تعلیمی ادارے میں جس طرح بدلا وہ اصل میں کالج کے یونیورسٹی ہونے کا کامیاب سفر تھا۔

سر سید کی اکثر علمی توقعات ان کی وفات کے وقت تک پوری ہو چکی تھیں مدرسۃ العلوم کو کالج کا نام ملا۔ 1877ء میں قائم شدہ اس کالج کے لیے ملک اور بیرون ملک کے بہترین، قابل اور ہونہار اساتذہ ملے۔ سید محمود مسٹر سڈون اور مسٹر بیک تو تھے ہی، سر ٹامس آرنلڈ، سر والٹر رائے تھے اور سب سے بڑھ کر علامہ شبلی تھے جن کو سر سید کے دوست مولوی سمیع اللہ کی مردم شناس نگاہ نے منتخب کیا تھا۔ ان کے علاوہ محمد اکبر کاندھلوی، سر تھیوڈو باریسن اور مسٹر آرسی بالڈ جیسے اساتذہ تھے جو آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی یونیورسٹیوں کے معیار کے تھے۔

سر سید نے ملک و قوم کے لیے جو تعلیمی انقلاب پیدا کیا وہ اپنی اہمیت اور مستقبل میں اپنے نتائج کے لحاظ سے ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو

ناقابل یقین ہی کہا جاسکتا ہے۔ ایک قلیل عرصہ میں یعنی محمڈن اسکول 1875ء اور محمڈن کالج 1878ء کے قیام کے چند برسوں میں قوم کے تعلیمی مزاج کو نفرت سے قبولیت کی منزل تک لانا یہ سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ سرسید کے دیگر کارنامے کم نہیں، اس کے لیے حیات جاوید جیسی کتاب مثال کے لیے کافی ہے جس میں سرسید کی تعلیمی خدمات کا ذکر قریب تین سو صفحات میں ہے تو ان کی سرکاری خدمات سیاسی اور ملکی اور مذہبی خدمات کا بیان بھی قریب ڈھائی سو صفحات میں ہے اور پوری کتاب ساڑھے آٹھ سو سے بھی صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب بجائے خود سرسید کی عظمت کی گواہ بن گئی ہے۔

مسلم یونیورسٹی یا ہندوستان میں جدید تعلیم کی کوئی تاریخ حیات جاوید کی مدد کے بغیر نہ مستند ہو سکتی ہے اور نہ قابل قبول، اس لیے بعد کے زمانہ میں شیخ اکرام جیسے نکتہ ور اور نکتہ چیں مورخ کو لکھنا پڑا کہ مسلمانوں کے مصائب اگر تمام تر اقتصادی ہوتے تب بھی ان کا حل آسان نہیں تھا لیکن سرسید کے زمانے میں جو نئے نئے مسائل پیش آرہے تھے وہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق تھے۔ اقتصادی اور مذہبی پستی کی اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کریں اور وہ اس سے بدکتے تھے، زبان اور نظم ونثر بھی جس سطح کی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ ایسی زبان اور ایسی نثر میں علمی مسائل پیش کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ قوم کی اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ ایک نئی زبان تیار ہو، نیا لٹریچر پیدا ہو، نئی شاعری ہو، سرسید کی تحریک نے یہ سب کیا۔ اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ سرسید کی تعلیمی اصلاح کا زمانہ اردو ادب کا بھی شاندار عہد ہے۔ اردو ادب کے عناصر خمسہ میں سے چار یعنی حالیؔ، شبلی، نذیر احمد اور خود سرسید اسی لیے قرار دیے گئے۔ اس کے علاوہ سرسید کی یہی تعلیمی انقلابی کوشش تھی جس نے محسن الملک، وقار الملک، خواجہ غلام الثقلین، چراغ علی جیسے اہل قلم اور خطیب ومقرر پیدا کر دیے۔

یہاں خلاصہ کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ بھی ذہن میں رہنے کے لائق ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اگر پہلی بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے نئے انداز کلام سے دنیا کو روشناس کرایا، اردو خطابت کی پہلی تربیت گاہ دراصل یہی کانفرنس ہے۔ اس کی آغوش میں وقت کے بلند پایہ ارباب ادب کی خطیبانہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں، اس کانفرنس کے پلیٹ فارم نے انہیں عوام الناس سے متعارف کرایا اور یہیں حقیقت میں ان کی شخصیتوں کے دبے ہوئے نقوش ابھرے۔

سرسید کے بارے میں ایک عظیم دانشور اور ڈاکٹر سید عابد حسین کا یہ جملہ بھی سرسید اور علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد کر سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''سرسید کو اس تدبر اور حکمت عملی کا بچا کھچا سرمایہ ملا تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے سات آٹھ سو برس ہندوستان پر حکومت کی''۔

مسلم یونیورسٹی کے تخیل کو حقیقت میں بدلنے کا ایک مرحلہ سرسید کی وفات پر پورا ہوا لیکن انہوں نے اپنے رفقا کی شکل میں جو سرمایہ چھوڑا اس نے قریب بائیس سال بعد اس خواب کو جس طرح حقیقت میں ڈھالا، وہ آگے پیش کیا جاتا ہے۔

4.3.10 سرسید کا انتقال اور کالج کی حالت

سرسید کا انتقال 1898ء میں ہوا۔ اس سے قریب دس سال پہلے 1889ء میں ایم اے او کالج کی مینیجنگ کمیٹی کی جگہ ٹرسٹی بل کو

منظوری ملی، جس کی رو سے سر سید سکریٹری اور ان کے بیٹے سید محمد جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے۔

اس وقت کالج کی مالی حالت بہتر تھی اور بہتر ہوتی جارہی تھی لیکن جب سر سید کی وفات ہوئی تو بقول شیخ اکرام مصنف موج کوثر "کالج کی کشتی ہچکولے کھارہی تھی، پچاس ہزار کا قرض تھا، آمدنی اتنی بھی نہ تھی کہ روزمرہ کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ غبن کے واقعہ کے بعد چندہ آنا بند ہو گیا تھا، اس کے بعد طلبہ بھی کم ہونے لگے۔ 1895ء میں کالج میں 565 طالب علم تھے، 1898 میں سر سید کی وفات کے چار روز بعد طلبہ کی تعداد صرف 343 رہ گئی۔ کالج کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا اور ڈر تھا کہ سر سید، مولوی سمیع اللہ اور سر سید کے رفقاء کی ساری محنت ضائع نہ ہو جائے۔ ایسے موقع پر ٹرسٹیوں نے سمجھداری سے کام لیا۔ سید محمود جو اب سکریٹری تھے لیکن حالات ان سے سنبھل نہیں رہے تھے اس لیے نواب محسن الملک کو سر سید کا جانشین چنا گیا اور ان کو ٹرسٹی بورڈ کا سکریٹری مقرر کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ کالج کے لیے جتنا صحیح ثابت ہوا اس سے زیادہ نواب محسن الملک کی کامیابی کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک سے ملی۔

مالی لحاظ سے 1898ء میں سالانہ آمدنی 76 ہزار تھی جو نو سال میں یعنی محسن الملک کے انتقال کے سال (1907ء) تک ڈیڑھ لاکھ ہو گئی، مسلم یونیورسٹی بنانے کی تحریک سے چھ لاکھ کا چندہ جمع ہو گیا۔ اس کے علاوہ کالج کے طلبہ کی شہرت بھی عروج پر پہنچ گئی۔

4.4 فرہنگ

گہر : اصل، نسل، مکمل، جوہر

واگذاشت : قبضہ دے دینا، قبضے سے چھڑایا ہوا

سرزد : واقع، صادر، ظاہر

جوانمردی : دلیری، شجاعت، ہمت، حوصلہ

ناپید : نظروں سے اوجھل، غائب، مفقود

مسرف : بیجا اور فضول خرچ کرنے والا

4.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- 17، اکتوبر 1817ء میں سر سید دلی میں پیدا ہوئے، سر سید کی تقریب بسم اللہ وقت کے بڑے بزرگ شاہ غلام علیؒ نے کرائی۔ پھر گھر ہی میں ایک قدیم شریف گھر کی نوکرانی سے انہوں نے قرآن مجید پڑھا، اس کے بعد مکتب میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ریاضی خاندانی علم تھا، اس لیے اس پر خاص توجہ رہی۔ سر سید کو شروع سے آلاتِ رصد جاننے کا شوق پیدا ہوا، اس لیے اس فن کی اہم کتابیں اپنے ماموں سے پڑھ لیں، طب کی تعلیم بھی حاصل کی، یہ سب اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انہوں نے حاصل کر لیا۔

- سرسید نے ہندوستانیوں کو انگریزوں کی حکومت اور اقتدار کے سایہ میں عزت کے ساتھ جینا سکھانا چاہا تھا۔ وہ ہر روز محکوم ہندوستانیوں کے احساس کمتری یا غلامی کو دور کرنے کے لیے مسلسل سماجی خدمات کے لیے خود کو وقف کرتے رہے۔
- سرسید بنارس سے 1876ء میں ملازمت سے پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے تو مدرسۃ العلوم کی زمین اور وہاں مدرسہ کے ابتدائی درجات شروع ہو چکے تھے۔ سرسید مستقل طور پر آئے تو علی گڑھ ضلع کے تمام رئیسوں اور سربر آوردہ لوگوں نے ان کے اعزاز میں جلسہ کیا۔ ان کو سپاس نامہ پیش کیا گیا۔
- سرسید علی گڑھ میں ہمیشہ کی طرح ہمہ تن اپنے مشن میں مصروف ہو گئے۔ مدرسۃ العلوم کی عمارتوں میں تیزی سے ترقی شروع ہوئی۔ پورے ہندوستان میں چندہ کے لیے کوششیں تیز تر ہونے لگیں اور پھر یہ ہوا کہ علی گڑھ صرف مدرسۃ العلوم یا دارالعلوم ہی نہیں رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی اتحاد، قومی مصالح اور قومی مقاصد کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب مدرسۃ العلوم، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قالب میں بدلنے کے لیے تیار ہوا۔

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.6.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. سرسید کب پیدا ہوئے؟

(a).1817ء (b).1917ء (c).1857ء (d).1947ء

2. آثار الصنادید کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a). سرسید احمد خاں (b). مدن موہن مالویہ (c). قاسم نانوتوی (d). سید علی مونگیری

3. 1859 میں سرسید نے کہاں مدرسہ قائم کیا؟

(a). مرادآباد (b). غازی پور (c). دہلی (d). علی گڑھ

4. آثار الصنادید کا ترجمہ گارساں دتاسی نے کس زبان میں کیا؟

(a). فرانسیسی (b). انگریزی (c). عربی (d). سریانی

5. سائنٹفک سوسائٹی کہاں قائم کی گئی؟

(a). غازی پور (b). حیدرآباد (c). بنارس (d). دہلی

4.6.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. سرسید کے حسب ونسب پر گفتگو کیجیے۔
2. سرسید احمد خاں کے تحقیقی مزاج پر روشنی ڈالیے۔

3. سرسید احمد خاں کے کارنامے تحریر کیجیے۔
4. اسباب بغاوت ہند لکھنے کی وجوہات بیان کیجیے۔
5. یونیورسٹی کے لیے سرسید کی کوششوں کا جائزہ لیجیے۔

4.6.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. سرسید احمد خاں کی ملازمت کے بارے میں تفصیل سے لکھیے۔
2. سرسید کے علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد ان کی کوششوں پر مضمون لکھیے۔
3. مرادآباد میں مدرسے کے قیام اور اسباب بغاوت ہند پر تحریر کیجیے۔

4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. بزم وفا، مدیر مشحون احمد، انجمن طلبائے قدیم لکھنؤ 2002ء
2. تاریخ علی گڑھ تحریک، پروفیسر مسز ممتاز معین اور پروفیسر انصار احمد خان، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس 1980ء۔
3. تہذیب الاخلاق مشاہیر علی گڑھ نمبر، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی فروری 2013ء، مارچ 2013ء، جون 2013ء، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
4. حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالیؔ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 1979ء۔
5. دی علی گڑھ موومنٹ، شان محمد، میناکشی پرکاشن میرٹھ، نئی دہلی 1975ء۔
6. سرسید اور علی گڑھ تحریک، ج 1، ڈاکٹر شائستہ خان، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 2017ء

معروضی سوالات کے جوابات

1. A	2. A	3. A	4.A	5. A

اکائی 5: شبلی نعمانی

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 شبلی نعمانی

5.2.1 حسب ونسب

5.2.2 ولادت

5.2.3 تعلیم وتربیت

5.2.4 تعلیمی اسفار

5.2.5 تحصیل علوم حدیث

5.2.6 وکالت کی تعلیم وملازمت

5.2.7 علی گڑھ سے وابستگی

5.2.8 علی گڑھ کے اثرات

5.2.9 کالج پر مولانا کے اثرات

5.3 تصنیفات

5.4 مستشرقین کے متعلق علامہ شبلی کی آراء

5.5 نظریہ تعلیم

5.6 دارالمصنفین

5.7 فرہنگ

5.8 اکتسابی نتائج

5.9 نمونہ امتحانی سوالات
5.9.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات
5.9.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات
5.9.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات
5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

انیسویں صدی میں اسلامی تہذیب وثقافت جدید تمدن ومعاشرت خاص کر مغربی تہذیب کے آگے دم توڑ رہی تھی۔ خلافت عثمانیہ اپنے وجود وبقا کی جنگ لڑ رہی تھی، مغربی طاقتیں مسلم سلطنتوں کا یکے بعد دیگرے خاتمہ کر رہی تھیں۔ امت مسلمہ سیاسی، سماجی، اقتصادی ومعاشرتی بحران کا شکار تھی۔ ایسے حالات میں اللہ تعالی نے اپنے دین حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وعدے کا مکمل ہونا بالکل برحق ہے۔ لیکن تکمیل وعدے کے لیے ظاہری تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے اللہ تعالی نے ہر زمانے میں اس ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا کرتا ہے جو اس ضرورت کو مکمل کر کے دین الہی کی حفاظت کا کام کرتے ہیں۔ ایسے ہی اشخاص میں علامہ شبلی نعمانی کا شمار ہوتا ہے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ:

- علامہ شبلی نعمانی کے حالاتِ زندگی اور ان کی علمی وادبی خدمات سے واقف ہو سکیں۔
- علامہ شبلی نعمانی کے افکار و نظریات اور ان کی معرکۃ الآراء تصانیف کا جائزہ لے سکیں۔
- اسی طرح آپ دارالمصنفین کے قیام اور اس کی وجوہات کے بارے میں مطالعہ کر سکیں۔

5.2 شبلی نعمانی

5.2.1 حسب ونسب

شمالی ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں بندول نامی گاؤں میں راجپوتوں کی آبادی تھی جس کے مورث اعلی تقریبا پانچ سو برس قبل مسلمان ہوئے تھے۔ اسی خاندان میں مولانا شبلی نعمانی کی پیدائش ہوئی۔ مولانا کے دادا کا نام منشی شیخ حسن علی تھا ان

کے چار بیٹے تھے، شیخ حبیب اللہ، شیخ مجیب اللہ، شیخ عجیب اللہ اور شیخ نجیب اللہ۔ مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ تھے۔ شیخ حبیب اللہ نے ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی کی پڑھائی کی اور اس میں خاص ذوق پیدا کیا۔ اس زمانے میں فارسی اور ابتدائی عربی کی تعلیم کے بعد لوگ قانون کا امتحان دیتے تھے، چونکہ شیخ صاحب کے گھر میں زمینداری اور مقدمات و قانون عدالت کا چرچہ تھا، لہذا دستور کے مطابق وکالت کی بھی تعلیم حاصل کی۔ اس پیشے میں ان کو ایسا فروغ ہوا کہ ضلع کے چوٹی کے وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ شیخ حبیب اللہ نے نیل کا بزنس بھی کیا اور دیسی شکر کے کارخانے قائم کیے تھے۔ مولانا کی والدہ ماجدہ نہایت نیک اور دیندار بی بی تھیں، تہجد تک ناغہ نہیں کرتی تھیں۔ ان دونوں سے اللہ نے ان کو چار بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی۔ ان چاروں بھائیوں میں علامہ شبلی سب سے بڑے تھے۔

5.2.2 ولادت

مولانا شبلی نعمانی کی ولادت ذیقعدہ 1273ھ بمطابق جون 1857 میں عین اس ہنگامہ خیز زمانے میں ہوئی جو عام طور سے غدر کے نام سے مشہور ہے۔ والدین نے بچے کا نام محمد شبلی رکھا۔ غالباً یہ نام ان کے تصوفانہ ذوق کا پتہ دیتا ہے، شبلی مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ شبلی بغدادی کی طرف منسوب ہے۔ ابتدائی تحریروں میں مولانا اپنا نام محمد شبلی ہی لکھتے تھے، بعد میں صرف شبلی کر دیا اور نام کے ساتھ نعمانی لکھنے لگے۔ نعمانی کا لقب مولانا نے خود سے نہیں اختیار کیا بلکہ ان کے استاذ مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی نے رکھ دیا۔ کیونکہ علامہ شبلی اپنے آپ کو حنفی کہلانا موجب فخر سمجھتے تھے اور ان کے استاذ بھی حنفی تھے اس لیے نعمانی ان کا لقب پڑ گیا۔

5.2.3 تعلیم و تربیت

مولانا کا بچپن بہت ناز و نعم میں گزرا، فطرۃ ذہین تھے اور حافظہ بھی قوی تھا، اس لیے ابتداء سے ہی دوران تدریس اساتذہ کی دلچسپی کا مرکز بنے رہتے تھے۔ اس وقت روایتی طور پر آپ کے والد نے انہیں علم دین کی خدمت کے لئے وقف کیا۔ بڑی دھوم سے اپنے بیٹے کا مکتب کرایا، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کی، ان کے گاؤں کے قریب جیراج پور کے ایک بزرگ حکیم عبداللہ صاحب مولانا شبلی کے پہلے مدرس تھے چنانچہ مولانا نے ابتدائی تعلیم ان ہی سے پائی۔ اساتذہ کی فہرست میں مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی کا نام اہم ہے بلکہ مولانا کی تعلیم کا حقیقی سلسلہ مولانا فاروق صاحب کے حلقہ تلمذ سے شروع ہوتا ہے۔ مولانا فاروق صاحب بڑے منطقی آدمی تھے وہ منطق کی نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی عملی مشق بھی کراتے تھے۔ جس کے نتیجے میں مولانا شبلی اپنی تحریر و تقریر میں منطقی ترتیب کے خوگر اور مناظروں کے مشتاق ہو گئے تھے، اور منطق و فن مناظرہ کے اصول سے ان کا ہر قدم اٹھتا تھا اور پڑتا تھا۔ مولانا فاروق ان دنوں غازی پور میں تھے وہیں پر مولانا شبلی حصول تعلیم کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ بعد میں علامہ شبلی اعظم گڑھ واپس آ گئے تھے اور مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ شاگرد کی کشش استاذ کو بھی یہیں مدرسہ عربیہ کھینچ لائی جہاں مولانا فاروق صاحب اس مدرسہ کے مدرس اول منتخب ہوئے۔

5.2.4 تعلیمی اسفار

علامہ شبلی نے درسیات کی تکمیل اگرچہ مولانا فاروق ہی سے کر لی تھی، لیکن ان کے ذوق علمی نے ان کو دوسرے خرمنوں کی خوشہ

چینی پر آمادہ کیا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب، فقہ، اور حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانہ عصر سمجھے جاتے، ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اس زمانے میں مدارس کا رواج کم تھا، زیادہ تر مشاہیر علماء اپنے قیام کی جگہ پر اپنا اپنا حلقہ درس لگاتے تھے۔ اس وقت یونیورسٹیاں یہی حلقہ درس ہوتی تھیں۔ ابتدا میں مولانا نے لکھنو کا سفر کیا لیکن جلد ہی وہاں سے رامپور گئے جہاں اس وقت دو باکمال ہستیاں اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ معقولات میں مولانا عبد الحق خیر آبادی اور فقہ میں مولانا ارشاد حسین مجددی۔ معقولات میں مولانا فاروق کے فیض سے خود علامہ شبلی کی اتنی بصیرت ہو چکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی۔ اس لئے علامہ نے صرف مولانا ارشاد حسین کے شرف تلمذ پر اکتفا کیا۔ جن سے علامہ نے فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ علامہ شبلی کو مولانا ارشاد صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے، اور مجتہدانہ ظرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا۔ رامپور سے تحصیل علم کے بعد مولانا کو مولانا فیض الحسن سے عربی ادب کی تعلیم کا ذوق پیدا ہوا۔ اس وقت مولانا فیض الحسن اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ابتدا میں علامہ کے والد کو اتنے طویل سفر پر بھیجنے میں تذبذب ہوا لیکن بعد میں انہوں نے اجازت دیدی۔ لاہور میں علامہ شبلی کو تلمذ کے لئے صرف اتنا وقت ملتا تھا جتنی دیر مولانا فیض الحسن صاحب کو کالج سے اپنے گھر میں پہنچنے میں صرف ہوتا تھا کیونکہ فیض الحسن صاحب ملازمت کی وجہ سے زیادہ وقت نہیں دے پا رہے تھے اور کالج کے کاموں میں ہی مصروف رہتے تھے۔ اسی دوران مولانا فیض الحسن کو دو ماہ کے لئے تعطیل ملی اور وہ سہارنپور چلے گئے، ناغہ نہ ہونے کے خیال سے شاگرد نے بھی سہارنپور کا سفر کیا اور استاذ کی معیت میں رہ کر کسب علم کیا۔ علامہ شبلی نے مولانا فیض الحسن صاحب سے عربی ادبیات کی کتابیں پڑھیں جن میں جمہرۃ العرب اور حماسہ قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ استاذ کا سب سے بڑا فیض قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی تھی، مولانا شبلی میں یہ ذوق اخیر عمر تک رہا۔

5.2.5 تحصیل علوم حدیث

اس زمانے کا دستور تھا کہ جب طلبہ ہر قسم کے علوم و فنون سے فراغت پا لیتے تھے، تب حدیث پڑھتے تھے، اسی اصول پر مولانا شبلی نے دوسرے تمام علوم سے فراغت پا کر حدیث کی طرف توجہ فرمائی اور جس طرح انہوں نے دوسرے علوم و فنون کی تعلیم کے لئے ان ہی اساتذہ کا انتخاب کیا جو اس فن میں ماہر تھے، اسی طرح حدیث کے لئے بھی انہوں نے اس زمانہ کے سب سے نامور محدث مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری کا انتخاب کیا۔ مولانا احمد علی کی سند و اجازت علم حدیث میں مولانا شاہ عبد القادر دہلوی اور مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر سے ملتی ہے وہ اپنے وقت میں ہندوستان کے سب سے بڑے محدث تسلیم کئے جاتے تھے۔ مولانا شبلی نے ان سے ہی درس حدیث و سند حاصل کی۔

5.2.6 وکالت کی تعلیم و ملازمت

مولانا کے والد کی یہ خواہش تھی کہ مذہبی علوم کی تحصیل کے بعد وہ وکالت کا پیشہ اختیار کریں کیونکہ ان کے نزدیک درس و تدریس کا شغل اقتصادی نقطہ نظر سے مناسب نہیں ہے لہذا وہ کسب معاش کی طرف متوجہ ہوں اور اس کے لئے مولانا کے والد کی نگاہ میں وکالت کا پیشہ موزوں نظر آیا۔ مگر خود مولانا کی بلند فطرت اور ذوق سلیم کو یہ چیز کھٹکتی تھی۔ بہر حال بادل ناخواستہ انہوں نے 1881 میں وکالت کا

امتحان پاس کر لیا۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے والد کے اصرار سے وہ وکالت پر آمادہ تو ہو گئے مگر اس عزم وارادہ کے ساتھ کہ ایک حرف بھی حق وصداقت کے سوا زبان یا قلم سے نہ نکلے گا، ظاہر ہے کہ ضلع کی وکالت ان شرائط کے ساتھ نبھ نہیں سکتی تھی، چنانچہ چند دنوں کے تجربہ نے خود مولانا کے والد پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اس ورع و تقوی کے ساتھ ان سے یہ وکالت کا پیشہ جو قدم قدم پر رنگ آمیزی کا محتاج ہے، چل نہیں سکتا۔

5.2.7 علی گڑھ سے وابستگی

سر سید کی تحریک سے متاثر بہت سے مسلمان جدید تعلیم کی طرف توجہ دے رہے تھے، انہیں میں علامہ کے والد شیخ حبیب اللہ بھی تھے، انہوں نے اپنے بیٹے مہدی حسن کو انگریزی پڑھانا شروع کیا اور ان کو علی گڑھ کالج کے اسکول میں تعلیم کے لئے بھیجا۔ 1881 میں ان سے ملنے کے لئے شیخ حبیب اللہ اور ساتھ میں علامہ شبلی بھی علی گڑھ تشریف لے گئے۔ علامہ سر سید کی مدح میں عربی کا ایک قصیدہ بھی لکھ کر لے گئے، جس میں سر سید کی طرف دو باتوں کی تعریف ہے، ایک ان کے حسب و نسب و سیادت کی، اور دوسرے ان کے قومی کاموں کی، سر سید نے اس قصیدہ کو دیکھا تو اس کے تیور، زبان، اور طرز ادا کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، اور قصیدہ کو اپنے اخبار علی گڑھ گزٹ میں چھپوا دیا۔

اس واقعہ کے سال ڈیڑھ سال بعد کالج کے مشرقی زبانوں کے ایک معلم کی ضرورت محسوس ہوئی، اس عہدہ پر تقرری کے لئے علامہ شبلی نے بھی درخواست بھری۔ خوش قسمتی سے ان کی تقرری کالج میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر عربک کے عہدہ پر جنوری 1883 میں ہوئی۔ مولانا کی اس کامیابی میں ڈپٹی محمد کریم صاحب اور مولوی سمیع اللہ خان نے معاونت کی تھی۔ علی گڑھ میں تعلیم و تدریس کے علاوہ علامہ نے شعر و شاعری کے ذوق پر توجہ مرکوز کی، جلد ہی ان کی شاعری کا چرچہ کالج کے احاطہ میں گونجنے لگا، خاص طور سے ان کی مثنوی "صبح امید" جس میں مسلمانوں کے عروج وزوال کی پر درد داستان کی شرح کے بعد سر سید کی نئی تحریک کی کامیابی پر ایک نئی صبح امید کے طلوع کی خوش خبری سنائی، مثنوی بار بار چھپی اور مقبول عام ہوئی۔

علی گڑھ سے وابستگی کے بعد مولانا شبلی اب ایسی آب وہوا میں تھے، جہاں ہر طرف نئے خیالات، نئے جذبات، زمانہ کے نئے اثرات، قدیم وجدید کی آمیزش کے نئے انقلابات گردوپیش تھے۔ ان اثرات اور جذبات کی نیرنگیوں میں حق و باطل اس طرح ملے ہوئے تھے کہ ان کے علیحدہ کرنے کے لئے غیر معمولی بصیرت کی ضرورت تھی۔ بحمد اللہ کہ مولانا میں یہ بصیرت موجود تھی۔

اب تک جدید تعلیم کے محاسن و معائب کی خبریں علامہ شبلی سنتے آئے تھے، لیکن علی گڑھ میں ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کا برملا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے"۔ اس بے باکانہ اظہار و بیان سے معلوم ہو گا کہ نئی تعلیم کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں اور حق و باطل کی تمیز کی پوری بصیرت ان میں موجود تھی۔

5.2.8 علی گڑھ کے اثرات

علی گڑھ سے وابستگی کے بعد مولانا شبلی کے افکار وخیالات پر مثبت اثرات مرتب ہوئے جن کو علامہ نے بہت جلد قبول کر لیا، ان میں سب سے پہلی چیز ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے، ان کی نظمیں ورنگین ترانے جو اب تک حسن وعشق کی جھوٹی کہانیوں سے لبریز ہوتے تھے، اب قوم وملت کے عشق میں خوں افشاں ہونے لگے، مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے؟ یہ احساس ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا۔

علی گڑھ تحریک کا دوسرا اثر ان پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر واضح ہو گئی، اپنے عزیزوں اور برادری کے لوگوں کو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا کام انہوں نے خود شروع کیا، اپنے عزیزوں کے نام خطوط لکھ کر انگریزی تعلیم کی طرف انہماک اور اس کے حصول کی تاکید پر ابھارا، 1883 میں نیشنل اسکول کے نام سے ایک انگریزی مدرسہ شہر اعظم گڑھ میں قائم کیا، خود سیکریٹری ہوئے، اور عزیزوں کو ممبر بنایا، ان کے والد بزرگوار، اور دوسرے عزیزوں وہمدردوں نے اس کی امداد میں شرکت کی۔ اس کی عمارت اور تعمیر کے لئے اپنے خاندان کی ملکیت سے زمین دلوائی۔ یہ اسکول صرف ایک ماسٹر اور تین طالب علموں سے شروع ہوا۔ بعد میں ترقی کی راہوں پر گامزن ہوا اور 1846 میں ڈگری کالج کا درجہ حاصل کیا، فی الحال یہ ''شبلی نیشنل کالج'' اعظم گڑھ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے اپنے گاؤں میں بھی ایک اسکول قائم کیا تھا لیکن وہ آگے نہ بڑھ سکا۔

علامہ شبلی نے علی گڑھ آنے کے بعد تاریخ کا مطالعہ پورے انہماک سے شروع کیا، خاص طور سے سرسید کے کتب خانہ میں عربی وجغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کی نظر میں آئیں جو یورپ یا مصر وشام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں، تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا، جس کی ابتداء ڈاکٹر لائٹنر کی کتاب ''سنین اسلام'' کے مطالعہ سے شروع ہوا، جو عربی وفارسی کے مشہور عالم اور اورینٹل کالج لاہور کے بانی اور پرنسپل تھے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے علامہ کو پہلے پہل ایک مکمل تاریخ لکھنے کا خیال آیا اور پھر گھٹ کر تاریخ بنی عباس تک محدود رہ گیا، لیکن یہ کام اتنا لمبا تھا کہ اس کو چھوڑ کر ہر خاندان کے ایک ایک ہیرو کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا اور اس کو نامور فرمان روایان اسلام سے موسوم کیا۔ نیز علی گڑھ ہی وہ مقام تھا جہاں اس وقت مشرق ومغرب کے اساتذہ یکجا تھے، اور ایک دوسرے کے خیالات ومعلومات سے متاثر ہو رہے تھے، علامہ شبلی کو بھی کالج آکر سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان کو یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا، اس کے لئے سب سے پہلا مواد سرسید کے کتب خانہ سے ان کو ہاتھ آیا، اس کے بعد خوش قسمتی سے اس وقت کالج میں پروفیسر آرنلڈ جیسا ایک انگریز عالم یہاں موجود تھا، پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا، یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز وسامان ہیں، قدیم علوم پر کیا کیا اعتراضات اور حملے ہیں، علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا، جو اصول عمدہ تھے ان کو اخذ کیا، بلکہ اپنی زندگی کا رہبر بنایا اور نمائشی چیزوں کو رد کر دیا۔

5.2.9 کالج پر مولانا کے اثرات

محمڈن کالج علی گڑھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا، جس میں انگریز، ہندو، مسلمان ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے، ایسے ماحول میں ایک روایتی قسم کا عالم دین، جس نے جدید طرز زندگی، انگریزی زبان اور انگریزوں کی صحبت سے بالکل نا آشنا ہو، وہ یکایک آیا اور پورے ماحول میں رہ کر اس طرح سب میں سما گیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا، یہ بجائے خود ایک کمال ہے، اور کالج نے قدیم وجدید کی اس ہم آہنگی اور تعاون سے بڑا فائدہ اٹھایا، اور وہ چپقلش اور کشاکش نہ ہونے پائی جس کا ہونا ایسے ماحول میں ضروری تھا۔

علامہ شبلی نے نئے علوم وفنون کے اہل کمال سے مرعوب ہونے کے بجائے، انہوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علماء اسلام کی قدر ومنزلت کو بڑھادیا، اور اپنے قدیم وعلوم وفنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو ان کی تحصیل پر مجبور کر دیا، اور ایسے زمانہ میں جب کہ کالج میں ہر طرف نئے علوم وفنون، مسائل اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی، اس مسلسل بارش کے طوفان میں علامہ شبلی نعمانی ہی تھے جو اسلامی علم وفن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ اس کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔

کالج پر مولانا کا ایک اور اثر جو پڑا وہ پرانے علوم، فارسی ادب، اور عربی زبان کا ذوق پیدا کرنا تھا، حالانکہ ایک نئے طرز کے ادارہ میں پرانے علوم اور زبان وادب کو جگہ دینا ایک مشکل کام تھا، لیکن علامہ نے اس مشکل کام کو ایسا انجام دیا کہ کئی ہونہار طلبہ نے ان علوم میں ناموری حاصل کی، جن میں مولوی حمید الدین صاحب، مولوی بہادر علی صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا نے کالج کے طلبہ کو درس قرآن دینا شروع کیا، اور اس درس کو ایسا دلچسپ بنادیا کہ طلبہ بڑی توجہ سے اس کو پڑھنے لگے، اور ان میں قرآن پاک کا ذوق پیدا ہونے لگا۔ نیز طلبہ میں ذات پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن عقیدت اور واقفیت پیدا کرنے کے لئے عربی میں سیرت کا ایک مختصر رسالہ "بدء الاسلام" لکھا اور وہ کالج کے نصاب تعلیم میں داخل ہوا، اسی سلسلہ میں مولانا نے کالج میں میلاد کی مجلسوں کی بنیاد ڈالی، شروع شروع میں یہ جلسہ خود اپنے بنگلے پر کرتے تھے، خود سیرت نبوی ﷺ کے کسی پہلو پر تقریر کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان جلسوں سے دل چسپی بڑھنے لگی، تو 30 اکتوبر 1891 میں سیرت ومیلاد کا پہلا جلسہ عام نہایت شان وشوکت سے سالار منزل میں ہوا، اور کچھ عرصہ بعد اسٹریچی ہال میں ہونے لگا۔

انگریزی کے طالب علموں میں جہاں کی فضا ہی کچھ اور ہوتی ہے، مذہبی رنگ پیدا کرنا کتنا مشکل کام تھا، مگر مولانا نے کالج میں اس کام کو جس طرح انجام دیا وہ ان کی ذہانت اور بردباری کا مظہر ہے۔ اس طرح سے مولانا نے نہ صرف کالج کے اثرات کو قبول کیا بلکہ خود بھی کالج کے ماحول پر بہت سے اثرات مرتب کئے، جس میں طلبہ کو مذہب سے وابستہ کرنا اور ان میں دل چسپی پیدا کرنا علامہ شبلی کی زندگی کا اعزازی پہلو ہے۔

5.3 تصنیفات

علامہ شبلی کو قیام علی گڑھ میں اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ اسلام کی خدمت کا صحیح راستہ جو اس زمانے کے لحاظ سے موزوں نظر آرہا تھا وہ تصنیف کا راستہ تھا کیونکہ یورپ کی چیرہ دستی کا جو رعب مسلمانوں پر چھا گیا تھا اور جس کے مقابلے میں ان کو نہ صرف اپنا حال بلکہ ماضی تک تاریک نظر آرہا تھا، اس کو دور کرنے اور اس کا تریاق ٹھیک اسی طرز میں تھا جس کو استعمال کر کے اہل مغرب نے مسلمانوں پر اپنا رعب قائم کیا تھا۔ اس وقت یورپ کے اہل قلم اور مصنفین کا کارنامہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ پر جو ناز تھا اس کو مٹانے کے لئے اسلام، سلاطین اسلام، اور علوم اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ کر لوگوں میں پھیلا رہے تھے، تاکہ مسلمانوں کی نئی پود کو اپنی قوم سے نفرت ہونے لگے، اور ان کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہونچے کہ ان کے دماغ سے امت سے محبت و اخوت ہمیشہ کے لئے مضمحل ہو جائیں، چنانچہ ان کی تدبیر کارگر ہو چلی تھی، اور خود مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے گھن آنے لگی تھی، اور یورپ کی ترقیوں کو دیکھ کر ان کو چکا چوندھ لگ رہی تھی، علامہ شبلی نے ان کی اس تدبیر کو سمجھا، اور اسی کے مقابلہ کے لئے اپنی قلم کو جنبش دی۔

اس سلسلہ میں مولانا نے اپنی پہلی تصنیف جس کا نام ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' ہے 1887 میں لکھی، جب یہ مضمون عوام الناس کے ہاتھوں میں پہنچا تو خوب اس کی پذیرائی ہوئی اور ہر عام و خاص میں مقبول ہوا۔ اس میں علامہ نے مسلمانوں کے طریقہ تعلیم، اور اسلامی مدرسوں کے نام، خصوصیات و حالات بیان کئے ہیں۔ یہ ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی۔

اس کے بعد اردو کی دوسری نئی طرز کی سوانح عمری ''المامون'' ہے، جو 1887 میں شائع ہوئی۔ یہ مولانا شبلی کی پہلی مستقل تصنیف ہے، جو ان کے نامور فرمانروایان اسلام کی پہلی کڑی ہے، اس کو تاریخ بنو عباس کا نچوڑ کہنا چاہیے، یہ تصنیف ایسی مقبول ہوئی کہ تین مہینے میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اس کے بعد علامہ کی ایک اور نایاب تصنیف ''سیرۃ النعمان'' 1891 میں چھپی۔ یہ کتاب در حقیقت مولانا کے اسی ذوق و شوق کی دوسری شکل ہے، جو ان کو حضرت امام ابو حنیفہؒ اور فقہ حنفی سے ہمیشہ سے تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ پر ایک مضمون لکھا جس میں یورپی مصنفین کے اس الزام کی تردید کی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اسکندریہ کا مشہور کتب خانہ مسلمانوں نے جلا کر خاکستر کر دیا تھا، علامہ شبلی نے اس الزام کی تردید کی اور اپنے مضمون ''کتب خانہ اسکندریہ'' میں یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کی فتح سے پہلے ہی کتب خانہ برباد ہو چکا تھا۔

''الفاروق'' علامہ شبلی کی ان نادر تصانیف میں سے ہے جس سے علامہ کی علمی لیاقت و قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ علامہ نے اس کتاب میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت مبارکہ کے گوشے کھول کر بیان کیا ہے، خلیفہ کی مثالی شخصیت، انتظامی صلاحیت، اور دوسری تمام طرح کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے تعلق سے مستشرقین کے جو اعتراضات تھے ان کو بھی مولانا نے رد کیا ہے۔ اس تصنیف کے بعد مولانا کی شہرت کا آفتاب نصف النہار کو پہنچ چکا تھا۔ انگریز حکومت نے بھی ان کی پذیرائی میں 1894 میں انہیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔

علامہ شبلی کی تصنیفات میں سب سے اہم اور یگانہ روز گار کتاب ''سیرۃ النبی'' ہے، یہ اس ذات پاک کی سیرت ہے جس کی سوانح عمری ایسی لکھی جانی چاہیے جس سے صاحب سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے، اسی جذبہ کے تحت علامہ شبلی نے سیرۃ النبی لکھنے کا ارادہ کیا گو یہ کام بہت مشکل تھا کیونکہ ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرور کائنات ﷺ کی عقیدت اور مرتبہ اتنا بلند ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی، اس لئے سیرت کی کوئی کتاب مشکل سے ہی معیار پر اتر سکتی ہے۔ اس مشکل کے باوجود سیرت کی ضرورت کے لئے مسلمانوں کی طرف سے بار بار رہ رہ کر آوازیں بلند ہوتی تھیں اور علامہ شبلی ان کو سن کر چپ رہ جاتے تھے، لیکن جدید تعلیم جس تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی، مذہبی بے خبری بھی اسی قدر بڑھتی چلی جارہی تھی جس کی روک تھام کی بڑی ضرورت تھی، اس ضرورت کا احساس مولانا کو اس وقت ہوا جب مستشرقین کی کتابیں سیرت رسول ﷺ پر طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلا رہی تھیں خاص کر علم جدید کے نوجوان طبقہ کو وہ بہت متاثر کر رہی تھیں چنانچہ علامہ نے اس ضرورت کو پورا کرنے کا اعلان 1912 میں کیا۔

اس کتاب کو علامہ نے بڑی تحقیق و تلاش و جستجو سے لکھی ہے، اس کے لئے مولانا نے قدیم مصادر کی جانب رجوع کیا، جس میں تاریخ طبری، سیرت ابن ہشام، ابن کثیر، تفسیر فتح البیان، طبقات ابن سعد وغیرہ قابل ذکر ہیں، مولانا نے اپنی کتاب ''سیرت النبی ﷺ'' میں تحقیقی طریقہ کار اختیار کیا ہے، جس میں ذات محمد ﷺ کے متعلق جو غلط بیانیاں یا خدشات پھیل رہے تھے مولانا نے ان کا مسکت جواب دیا ہے، مثلاً مر گولوس جو آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر تھا اس کی کتاب ''لائف آف محمد'' میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ عبد المطلب، مطلب کے غلام تھے، کعبہ آنحضرت ﷺ سے صرف 100 سال پہلے کی عمارت ہے، علامہ نے اس کا رد کیا ہے اور جن رواۃ پر موصوف پروفیسر نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا ان رواۃ کی نقد و جرح کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ روایات نا قابل اعتبار ہیں جن پر مر گولوس نے تکیہ کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ مولانا اپنے سیرت کے مسودے کو مکمل نہ کر سکے اس سے پہلے ہی انہوں نے دار فانی سے دار اجل کی طرف لبیک کہہ دیا۔ لیکن اپنی وفات سے پہلے انہوں نے یہ وصیت کر دی تھی کہ یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کر دئے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہر گز نہ دئے جائیں۔ اس سیرت کے مسودہ کو بعد میں ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے علامہ کی خواہش کے مطابق مکمل کیا۔

ان کتابوں کے علاوہ مولانا کی دیگر اہم کتابیں ''الغزالی''، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا روم، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

5.4 مستشرقین کے متعلق علامہ شبلی کی آراء

مولانا شبلی کا دور مسلمانوں کی تنزلی کے دور سے متعلق ہے، اس دور میں یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم، تمدن و تاریخ کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا، اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کر رہے تھے۔ علامہ شبلی نے یورپ کے مصنفین کے سحر کو توڑنے کا عزم مصمم کیا۔

مولانا شبلی کا کام متعدد وجوہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے، ان میں سب سے اہم تو یہ ہے کہ مولانا جن معترضین کا جواب دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے وہ ان پڑھ مشنریوں میں نہ تھے، اور نہ مناظرانہ یا الزامی جواب ان کے لئے کافی تھے، ان کے جواب دینے کے لئے

ضرورت یہ تھی کہ ایک ایک کونہ سے نادر کتابوں کی تلاش اور ورق گردانی کی جائے، ان کے بتائے ہوئے حوالوں کی غلطی اور کمزوری بتائی جائے، اور اس کے بالمقابل اسلامی علوم وفنون اور تاریخ وتمدن کے شاندار واقعات اور اہم کارناموں کو ابنائے زمانہ کے سامنے لایا جائے، تاکہ اسلام کی تاریخ وتمدنی عظمت اور علمی جلالت سب کے سامنے آجائے، جس سے قوم کے افسردہ دلوں میں از سر نو تازگی اور امنگ بھی پیدا ہو، اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات کی بے مائیگی کا بھی اندازہ ہو۔ علامہ شبلی نے ان امور کو مطمح نظر رکھا، اس کی ابتدا انہوں نے مستشرقین کے علمی لیاقت سے کی تاکہ ان کی کتابوں پر اعتماد اور رشک کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ وہ کس نوعیت کا علم رکھتے ہیں۔

1. یورپ کی پیغمبر اسلام سے ابتدائی واقفیت

علامہ شبلی نے پیغمبر اسلام سے متعلق ان مغربی مصنفین کی معلومات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا، جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، مثلاً عیسائیوں کے نزدیک ہر مسلمان مشرک وبت پرست تھا اور حسب ترتیب مسلمانوں کے تین خدا تھے، ماہوم یاماہون یامافومیڈ (یعنی محامڈ) دوسرا اُپلین اور تیسرا ٹرماگان، لیکن یہ تمام تر خیالات ودعوے محض بہتان اور افتراء پردازی پر منحصر تھے۔ بعد میں جب یورپ کا نشاۃ ثانیہ ہوا تو اس وقت سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام اور سیرت پیغمبر ﷺ کی بنیاد عربی تصانیف کی بنیاد پر قائم کی گئی، اگرچہ موقع بہ موقع معلومات سابقہ کے استعمال سے بھی پرہیز نہیں کیا گیا۔ اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجے سے نجات پائی اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور الگ ہو گئے، اس بنا پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ ہو گئیں، پہلی جماعت میں عوام اور مذہبی اشخاص تھے جبکہ دوسری جماعت میں محقق اور غیر متعصب لوگ تھے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ یوروپی زبانوں میں ہو رہا تھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ارپی نیوس، مارگولیتھ، ایڈورڈ پوکاک اور ہاٹنجر قابل ذکر ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں جو قرون ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے۔ جیسے سعید بن بطریق اوٹیکوس المتوفی 939ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا اور ابن العمید المکین المتوفی 1273ء جو سلاطین مصر کا ایک درباری تھا۔ ابن العمید المکین کی تاریخ، طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے، ارپی نیوس نے جو ہالینڈ کا ایک مستشرق تھا، لاطینی ترجمہ کے ساتھ لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے دولت اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے اخیر تک یورپ کی سیاسی قوت، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہو گئی تھی جس نے "اورینٹلسٹ" کی ایک کثیر تعداد پیدا کر دی تھی، مستشرقین کی اس جماعت نے حکومت کے اشارے سے مشرقی زبانوں کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع واشاعت کے سامان پیدا کئے اور اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔ اس کام میں ہالینڈ نے پہل کی اور اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں 1778ء میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، اس کی تقلید دوسری سامراجی قوتوں نے

بھی کی، انگریزوں نے بھی 1788ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، اس کے بعد 1795ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درس گاہیں اور انجمنیں جاری ہو گئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔ مسلمانوں کے یہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کر کے باستثنائے چند اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں سے اکثر کا یوروپین زبانوں میں ترجمہ ہو گیا، ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت، ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگاران پیغمبر عرب ﷺ کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

2. مستشرقین یورپ کے گروپ

مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کئے جاسکتے ہیں: پہلا وہ گروپ جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصانیف اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست ہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں سے بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔

دوسرا گروپ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو عربی زبان، علم ادب اور تاریخ فلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلام کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمن کا مشہور فاضل سخاؤ جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے، اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے اس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا (جلد 16) میں قرآن پر جو اس کا آرٹیکل ہے، جابجانہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

تیسرا گروپ ایسے مستشرقین کا ہے جنہوں نے خاص اسلامی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر صاحب یا مارگولیتھ صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔ مارگولیتھ نے مسند امام احمد ابن حنبل کی 6 ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہم سری کا دعوی نہیں ہو سکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب وافتراء اور تاویل و تعصب کے لئے پیش نہیں کر سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بد

منظر بنا دیتا ہے۔ اسی طرح سے علامہ شبلی ڈاکٹر اسپرنگر، جرمنی کا مشہور عربی داں، کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ موصوف کئی سال تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے، لکھنؤ میں آکر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گزری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب "کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ" اول اول انہوں نے تصحیح کر کے کلکتہ میں شائع کرائی، لیکن جب آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب 3 جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ رہ گئے۔

3. مستشرقین کی غلط کاریوں کے اسباب

یوروپین مصنفین کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو وہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، لیکن علامہ شبلی کے نزدیک بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں: پہلی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد ابن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کریگا کہ اس کو تصنیفات سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، بہر حال مصنفین سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں مثلاً سیف، سری، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں، اس لئے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہو سکتی ہے لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے، ان کے لئے یہ سرمایہ قابل قبول نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی مثلاً مارگولیتھ تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سینکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔

دوسری بڑی وجہ یہ کہ یورپ کے اصول تنقیحِ شہادت اور ہمارے اصولِ تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں، حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں، فرض کرو ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائنِ موجودہ اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کر لی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے، بلکہ سب سے پہلے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ "اسماء رجال" کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے کہ نہیں، اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابل اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو لیکن اس کی روایت قبول کر لی جائیگی۔ اس اختلاف اصول نے یوروپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا، مثلاً اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام

کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دل چسپ بنا سکتی ہیں سب موجود ہوتی ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتی ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہیں، اس میں قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعہ سے اس سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے، لیکن یہ جرات صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں۔ تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقعہ پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں، ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کئے ہیں اور بعض جگہ وہ خود بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

4. یوروپین مصنفین کے اصول مشترکہ

علامہ شبلی کے نزدیک مستشرقین جب آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا ان کی کتابوں سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ: آنحضرت ﷺ کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے، لیکن مدینہ میں جاکر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعتاً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خوں ریزی، خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ کثرت ازدواج اور عورتوں کی طرف میلان، مذہب کی اشاعت جبر و زور سے، لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل، دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جائی۔ یہ وہ امور ہیں جن کو سامنے رکھ کر اہل یورپ پیغمبر اسلام اور اسلامی تعلیمات پر نقد و جرح کرتے ہیں۔

5.5 نظریہ تعلیم

مولانا سے پہلے علماء پر مدرسیت اتنی چھاگئی تھی کہ ان کی نظر درسی کتابوں اور ان کے شروح و حواشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا، کسی اور علم و فن سے استفادہ، قلمی کتابوں کی تلاش اور نوادر کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا، علامہ کو اللہ تعالی نے یہ ذوق فطرت عنایت فرمایا انہوں نے ہر علم و فن کی بکثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادر کتب بہ کثرت بہم پہنچائے، کتب خانے چھانے، دنیا کے کونے کونے سے مطبوعات منگوائے، ادب، فتوح، تاریخ، فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا اور اپنی تصنیفات و مضامین میں ان کے حوالے دئے، طلبہ اور علماء کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی اور اپنے شاگردوں اور ہم نشینوں میں اس کا ذوق پیدا کیا، اور پھر جب ان کو کامل یقین ہو گیا کہ مدرسے کے نصاب میں اصلاح کی ضرورت ہے تو باقاعدہ اپنا نظریہ تعلیم پیش کیا۔

1. ندوۃ العلماء میں شرکت

انیسویں صدی کے اواخر میں ملک بھر میں طوفان اٹھ رہے تھے، ان سے حساس مسلمانوں کے دل مضطرب تھے، مدارس و مکاتب کا پرانا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا، انگریزی اسکول اور کالج میں مسلمان لڑکے کھنچ رہے تھے، حکومت کے اثر سے عیسائیت کا چرچہ تھا مشنریوں کے جال ہر جگہ پھیلے تھے، مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظروں کی گرم بازاری تھی، دونوں طرف سے رسالے لکھے جا رہے تھے، یورپ کے نئے

خیالات سیلاب کی طرح امڈے چلے آرہے تھے، عام علماء زیادہ تر پڑھنے پڑھانے میں مصروف، کچھ معمولی معمولی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھے تھے، اور خواص تقلید وعدم تقلید، قرأت فاتحہ، آمین بالجہر اور رفع یدین کے مسئلوں میں ایسے گتھے تھے کہ مناظرہ، مجادلہ اور مجادلہ مقاتلہ بن گیا تھا، خدا کے گھر لڑائی کے میدان بن گئے تھے، مدرسوں میں پرانا فرسودہ طریقۂ درس جاری تھا، جو زمانہ کے انقلاب سے بیکار اور نئے زمانہ کے لئے قوم کے نئے رہبر اور رہنما پیدا کرنے سے قاصر تھا۔

اس صورت حال میں حسن اتفاق سے چند مفکر ملت نے مدرسۂ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر 1892ء میں اس سنگین اور ہنگامہ خیز دور میں قوم کی طرف توجہ مبذول کی، اور پہلی بار علماء کی مجلس (ندوۃ العلماء) کے انعقاد کا تصور آیا، جس کا مقصد اس صورت حال سے نمٹنے کا حل تلاش کرنا تھا، اسی مدرسہ فیض عام کانپور کے آئندہ اجلاس 24.23.22 اپریل 1894ء میں علامہ شبلی نعمانی کو بھی شرکت کی درخواست موصول ہوئی جس کو انہوں نے قبول کر لیا۔ وہ ایک تاریخی اجلاس تھا جس میں فرقہ واریت سے پرے ہر طبقہ کے علماء اس میں شامل تھے، علماء حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین شریک جلسہ تھے۔ اس جلسہ میں علامہ شبلی نے ندوۃ العلماء کا دستور العمل پیش کیا، جس میں کچھ تجاویز پیش ہوئیں: پہلی تجویز یہ تھی کہ موجودہ طریقۂ تعلیم قابل اصلاح ہے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شریک ہوں یا اپنے کسی مدرس یا وکیل کو بھیجیں، تیسری تجویز یہ تھی کہ جو مدارس اسلامیہ جابجا قائم ہیں ان کو کسی بڑے مدرسہ مثلاً دیوبند وغیرہ سے الحاق کیا جائے۔ ان تجاویز میں مدرسوں کا طریقہ تعلیم اور اس کی اصلاح نہایت اہمیت کا حامل ہے، اس کا دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ موجودہ حالات کو مد نظر رکھ کر دیکھا جائے تو مدارس کے نصاب میں کچھ کوتاہیاں ہیں جن کو دور کرنا ضروری ہے۔

2. تبدیلِ نصاب کی کوشش

اکتوبر 1902ء میں ندوہ کا سالانہ جلسہ امرتسر میں ہوا، ندوہ کا یہ سب سے پہلا جلسہ تھا جس میں علامہ شبلی نے اپنے خیالات کو ایک موزوں شکل میں پیش کیا، تبدیل نصاب کا مسودہ اور اس کی ترکیب بھی پیش کی، علامہ کے نزدیک، درجۂ متوسط سال سوم میں سے "ملا حسن"، "رسالہ میر زاہد"، "ملا جلال"، "قاضی مبارک"، "صدرا"، سب خارج کر دینا چاہئے، ان کے بجائے "شرح مطالع" کے بعض حصے، "حمد اللہ"، شرح ہدایۃ الحکمت از خیر آبادی، "رسائل ابن رشد مطبوعہ مصر"، "حماسہ"، "اعجاز القرآن باقلانی"، اور ہدایۃ معاملات (بشرط گنجائش) ہونا چاہئے۔ درجہ متوسط سال دوم میں سے "میبذی" (یہ سب سے زیادہ لائق کتاب ہے) "شرح عقائد نسفی"، "تشریح الافلاک" خارج ہونی چاہئے، مؤطا امام محمد، سبعہ معلقہ، جلالین قائم رہنا چاہئے، اور "رسائل اربعہ امام غزالی"، "الفوز الاصغر لابن مسکویہ" مطبوعۂ بیروت پڑھانا چاہئے۔ درجہ متوسط سال اول میں مشکاۃ کی ضرورت نہیں، "مختصر المعانی" قطعاً خارج کر دینا چاہئے، اور "حسن التوسل فی صناعۃ الرسل" مطبوعہ مصر اس کے بجائے رکھنا چاہئے، منتقی الابحر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

درجہ ابتدائی سال سوم میں "تلخیص" اور 'دیوانِ علی' (جو محض موضوع ہے) بالکل خارج، مشکاۃ کی بھی ضرورت نہیں، حدیث کا فن مستقل اخیر میں رکھا جائیگا۔ درجہ ابتدائی سال دوم اور سال سوم سے 'شافیہ' 'کافیہ' 'شرح جامی' قطعاً خارج، ان کی جگہ اس درجہ میں ہدایۃ

النحولانا چاہئے اور ''مفصل زمخشری'' کا اضافہ کرنا چاہئے، نیز کلیلہ ودمنہ ازابن المقفع مطبوعہ بمبئی کو بھی داخل نصاب کرنا چاہئے۔

علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ روایتی نصاب میں جو خامیاں وقت کے ساتھ پیدا ہو گئیں تھیں ان کو دور کیا جائے، منطق اور کلام کی جو کتابیں تھیں ان کی جگہ ایسے مضمون شامل کرنا چاہئے جو ماڈرن زمانے کے حساب سے موزوں اور مناسب ہو۔ نحو وصرف پر زیادہ وقت لگانے کے بجائے ان کی جگہ عربی ادب پر زور دینا چاہئے۔ لیکن ان کی یہ خواہش مکمل طور پر روبہ عمل میں نہ لائی جا سکی یہاں تک کہ ان کو دار لعلوم ندوۃ العلماء کی معتمدی پیش کی گئی۔

3. دارالعلوم ندوۃ العلماء کی معتمدی 1905ء۔1913ء

علامہ شبلی کا نام ندوہ کے معتمد کی حیثیت سے سب سے پہلے مارچ 1903ء کو بمقام شاہجہاں پور مولانا غلام محمد صاحب نے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا اور ارکان مجلس نے بالاتفاق منظور کر لیا اور طے ہوا کہ مولانا شبلی سے درخواست کی جائے کہ وہ لکھنو آکر قیام کریں مگر وہ ان دنوں نہ آسکے، لیکن بعد میں حیدرآباد سے استعفی دے کر وہ لکھنو آگئے اور گولہ گنج میں اس عمارت میں جو ''خاتون منزل'' کے نام سے جانی تھی، قیام کیا اور سب سے پہلا کام بحیثیت معتمدی کے نصاب کا اجرا کرنا تھا۔

4. جدید نصاب کا اجراء

دارالعلوم ندوۃ العلما کے قیام کا اصلی مقصد پرانے نصاب کی جگہ ایک نیا نصاب نافذ کرنا تھا جو روایتی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید ضرورتوں پر بھی پورا اترے، اور ایسے افراد کی ایک جماعت تیار کرنا تھا جو جدید چیلنجز کا مقابلہ کر سکے، انہی مقاصد کے پیش نظر علامہ شبلی نے بحیثیت معتمد سب سے پہلے نصاب میں جو غیر ضروری یا کم اہم مضامین پڑھائے جاتے تھے ان کو درس سے نکال کر ان کی جگہ کچھ نئے مضامین کو نصاب میں شامل کیا، مثلاً ادب اور فن بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا، فلسفہ جدیدہ میں ''دروس الادلیہ'' رکھی گئی جس میں سائنسی بحثیں ہیں، اسرار شریعت میں حجۃ اللہ البالغہ کو نصاب میں شامل کیا گیا، انگریزی زبان ضروری قرار دی گئی، ہندی اور سنسکرت کا درجہ بھی قائم کیا گیا جس کا مقصد ہندوستانی تہذیب وتمدن سیکھ کر اس کی صحیح ترجمانی اور آریوں کے بیجا اعتراضات کا رد کرنا تھا۔

الغرض علامہ شبلی جو نصاب چاہتے تھے، مجموعی طور پر اس میں عربی ادب، فن بلاغت اور تنقید کے علاوہ علوم اسلامیہ: تفسیر، علوم القرآن، عقائد وفلسفہ، اور اسرار شریعت سے متعلق بعض نئی کتابیں تھیں، جدید علوم میں انگریزی اور جدید فلسفہ وسائنس کی کتابیں۔ وہ جدید تعلیم کی تحصیل مسلمانوں کے لئے ضروری تو خیال کرتے تھے مگر اس میں ایسا انہماک پسند نہیں کرتے تھے، جو طلبہ کو دینی تعلیم سے غافل اور اپنی تاریخ وتہذیب سے بیگانہ کر دے، اس لئے علامہ کے تصور میں صرف ایسے کتب دینیات کی ضرورت ہے جس میں اسکول سے کالج تک کے قابل تین طرح کی کتابیں ہوں: عقائد، فقہ، اور تاریخ اسلام۔

اسکول کلاسوں میں صرف فقہ، تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو، کالج کی کلاسوں میں امام غزالی، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ کی چند مختص تصنیفات خود عربی زبان میں پڑھائی جائیں، مزید برآں ان کی رائے یہ بھی تھی کہ دینیات کے نتائج امتحانات کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے اور دو چار طلبہ کو وظائف دے کر ڈگری حاصل کرنے کے بعد اعلی درجہ کی تعلیم دی جائے۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی دین و دنیا کی خلیج پاٹنا اور قدیم و جدید کا ڈانڈا ملانا چاہتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک موجودہ دور میں نہ محض قدیم تعلیم سے مسلمانوں کے مسائل اور ضرورتوں کا حل ہے اور نہ صرف تعلیم جدید ہی ان کے دکھ و درد کی دوا ہے، دونوں کے مجموعے اور آمیزش میں ہی ان کے مسائل اور پریشانوں کا حل ہے۔

5.6 دارالمصنفین

دار لمصنفین ایک علمی و تحقیقی ادارہ ہے جو بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے مشرقی ضلع اعظم گڑھ میں واقع ہے، اس ادارے کا قیام علامہ شبلی نعمانی کا دیرینہ خواب تھا، جس کے قیام کی تجویز سب سے پہلے 1910ء میں پیش کی گئی تھی، علامہ شبلی کے نزدیک قومی و مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ، ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک کتب خانہ اعظم کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے، تو ضروری ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ تیار کیا جائے، ایک ایسی اکیڈمی بنائی جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم و فنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دورِ ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدماء کے عہد کی یادگاریں ہوں، اور ان سب باتوں کے ساتھ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو بلکہ وقف عام ہو تا کہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اس ادارے کے قیام کے لئے علامہ شبلی نے رات دن ایک کر دیا لوگوں سے وظائف کی مانگ کی۔ خود جتنی سکت اور حیثیت تھی اس ادارے میں صرف کر دی، اس کے لئے اپنے آبائی جائیداد سے زمین وقف کی، دارالمصنفین کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا تھا، لیکن ابھی وقف نامہ ہی زیر تحریر تھا کہ 18 نومبر 1914ء کو اس ادارے کی تکمیل کی حسرت لئے ہوئے ملت کا یہ نیر تاباں غروب ہو گیا، لیکن ان کے لائق شاگردوں کے ہاتھوں سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

فی الحال دارالمصنفین میں دار لتصنیف، دارالاشاعت، دارالطباعت اور شعبہ 'رسالہ معارف' اور دارالکتب جیسے شعبے ہیں، دار لمصنفین میں عربی، فارسی، انگریزی، اور اردو کی بہت سی نادر کتابوں کا مجموعہ ہے، ان میں احیاء العلوم، فتاوی عالمگیری، شرح نہج البلاغہ، کتاب المیزان، یہ کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ فارسی زبان کی نادر کتابوں میں اکبر نامہ، مونس الارواح، کلیات کلیم، تاریخ فرشتہ، قصص العجائب، تزک جہانگیری، مدارج النبوۃ قابل ذکر ہیں۔

5.7 فرہنگ

ذوق سلیم : کسی چیز یا بات کی حقیقت کو سمجھنے اور اس کے حسن و خوبی کا اندازہ کرنے کا صحیح ملکہ، صحیح ذوق

پُر دَرد : درد بھرا، دردناک، غمگین

بر دباری : بوجھ اٹھانا، برداشت کرنا، سنجیدگی

مظہر : ظاہر ہونے کی جگہ، نشانی، نمونہ

کشاکش : کھینچاتانی، چھینا جھپٹی

رازپنہاں : بھید پوشیدہ ہونا، چھپا ہوا ہونا، مخفی ہونا

مہتم بالشان : نہایت اہم اور ضروری، شان دار

ثقات : معتبر، جس کے قول و فعل پر اعتبار ہو

5.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- علامہ شبلی نعمانی ایک یگانہ روز گار محقق اور مصنف، ایک بے مثال سوانح نگار، ایک عظیم فلسفی اور مفکر، ایک مایہ ناز ماہر تعلیم اور معلم ہونے کے ساتھ ایک ایسے عالم دین تھے، جن کی فکر و نظر آج بھی حاملین علوم نبوت کے لئے مشعل راہ کا کام کر رہی ہے۔
- علامہ کی زندگی کا سب سے عظیم کارنامہ مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح تھی، اسی اصلاح اور ان کی گوناگوں شخصیت کا نتیجہ تھا کہ امت کو علامہ سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی، مسعود عالم ندوی اور ابوالحسن علی ندوی جیسے ممتاز عالم دین میسر ہوئے، ان کا تجویز کردہ نصاب اگر باقی رہتا تو افراد کی ایسی جماعت تیار ہو جاتی جو امت کے لئے مشعل راہ کا کام کرتی، لیکن بد قسمتی سے قدامت پرست گروپ نے ان کی اصلاحات کی مخالفت کی۔
- علامہ شبلی کا دوسرا اہم کام مستشرقین کے جال کو توڑنا تھا، مصنفین یورپ جس قدر تاریخ کو غلط انداز میں پیش کر کے عالم اسلام کی ممتاز شخصیتوں پر بہتان تراز ی اور تنقید کا نشانہ بنائے ہوئے تھے، علامہ نے ان تمام باطل پروپیگنڈے کی قلعی کھول دی، ان کی بہتان تراز یوں کا پردہ فاش کیا، سیرۃ النبی، الفاروق، النعمان جیسی سوانحی تاریخ لکھ کر اسلام، پیغمبر اسلام اور دیگر عمودی شخصیات کا دفاع کیا۔
- دار لمصنفین ایک علمی و تحقیقی ادارہ ہے جو بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے مشرقی ضلع اعظم گڑھ میں واقع ہے، اس ادارے کا قیام علامہ شبلی نعمانی کا دیرینہ خواب تھا، جس کے قیام کی تجویز سب سے پہلے 1910ء میں پیش کی گئی تھی، علامہ شبلی کے نزدیک قومی و مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ، ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک کتب خانہ اعظم کی بھی ضرورت ہے۔

5.9 نمونہ امتحانی سوالات

5.9.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. علامہ شبلی نعمانی کے والد کا کیا نام تھا؟

(a). محمد الیاس (b). شیخ حبیب اللہ (c). احمد الیاس (d). الیاس اختر

2. مندرجہ ذیل میں سے کون سی جگہ علامہ شبلی کی جائے پیدائش تھی؟

(a). بندول (b). آگرہ (c). لکھنؤ (d). مئو

3. علامہ شبلی نعمانی نے علم حدیث کس سے حاصل کیا؟

(a). مولانا احمد علی (b). مولانا فاروق چریا کوٹی (c). فیض الحسن (d). ارشاد حسین

4. علامہ شبلی نے اپنے والد کے اصرار پر کونسا پیشہ اختیار کیا؟

(a). بینک کاری (b). معلم (c). کلرک (d). وکالت

5. مندرجہ ذیل میں سے کون سی کتاب علامہ شبلی کی نہیں ہے؟

(a). المامون (b). الفاروق (c). احیاعلوم الدین (d). الکلام

6. مولانا کے کس شاگرد نے ان کی سیرۃ النبی کی تکمیل کی تھی؟

(a). سید سلیمان ندوی (b). مسعود ندوی (c). عبد السلام ندوی (d). سب غلط

7. علامہ شبلی کس سن میں دارالعلوم ندوۃ العلما کے معتمد بنے؟

(a). 1905ء (b). 1906ء (c). 1904ء (d). سب غلط

8. شبلی نعمانی کس سن میں علی گڑھ سے وابستہ ہوئے؟

(a). 1883ء (b). 1880ء (c). 1881ء (d). 1885ء

9. مولانا شبلی نے ابتدائی تعلیم کس سے حاصل کی؟

(a). عبد الحق خیر آبادی (b). مولانا فاروق چریا کوٹی (c). ارشاد حسین (d). فیض الحسن

10. علامہ شبلی نے کس سن میں علی گڑھ سے علیحدگی اختیار کی؟

(a). 1997ء (b). 1998ء (c). 1999ء (d). 1996ء

5.9.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. علامہ شبلی کی ابتدائی تعلیم پر مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
2. قیام علی گڑھ میں مولانا پر کالج کے اثرات قلم بند کیجیے۔
3. علامہ شبلی کے نزدیک مستشرقین کے اصول مشترکہ کیا ہیں؟ بیان کیجیے۔
4. علامہ کی تصانیف پر مختصر اروشنی ڈالیے۔
5. علامہ شبلی کے نزدیک انگریزی کی تعلیم کیوں ضروری ہے؟ واضح کیجیے۔

5.9.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. مستشرقین سے متعلق علامہ شبلی کی خدمات واضح کیجیے۔
2. مولانا شبلی کا نظریہ تعلیم کیا تھا وہ کیوں روایت اور جدیدیت کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے؟ مضمون لکھیے۔
3. دارالمصنفین کے مقصد قیام اور اس کی اہمیت پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجیے۔

5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. حیات شبلی : مولانا سید سلیمانی ندویؒ
2. سیرۃ النبی ﷺ : مولانا شبلی نعمانیؒ
3. علامہ شبلی نعمانی (معنویت کی بازیافت) : ڈاکٹر شباب الدین
4. علامہ شبلی نعمانی بحیثیت سوانح نگار : ڈاکٹر صفیہ بی

معروضی سوالات کے جوابات

1. B	2. A	3. B	4.D	5. C
6. A	7. A	8. A	9. B	10. B

اکائی 6: محمد اقبال

اکائی کے اجزا:

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

6.2.1 یورپ کا تعلیمی سفر

6.3 مغربی زندگی کے اقبال پر اثرات

6.4 اقبال کے سیاسی و علمی افکار

6.4.1 اقبال کا ملّی تصور

6.4.2 اقبال کے نزدیک ریاست کا تصور

6.4.3 علامہ اقبال اور تصوّف

6.4.4 اقبال کا نظریۂ تعلیم

6.5 فرہنگ

6.6 اکتسابی نتائج

6.7 نمونہ امتحانی سوالات

6.7.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

6.7.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

6.7.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

6.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

اسلام کی جس طرح سیاسی تاریخ روشن اور تابناک ہے، اسی طرح اس کی علمی اور فکری تاریخ بھی انتہائی سنہری اور شاندار ہے، اہل علم اور مفکرین کی خدمات اور کارناموں پر اسلامی تاریخ کے صفحات گواہ ہیں، علامہ محمد اقبالؒ اسلام کی اس ساڑھے چودہ سو سالہ علمی وفکری تاریخ کے وارث اور امین ہیں، وہ بنیادی طور پر ایک شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں؛ لیکن حقیقت میں شاعری ان کی تجدیدی واصلاحی خدمات کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے، وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ایک فلسفی، مفکر، ماہر قانون اور مصلح ہیں، ان کی شاعری تعمیری اور اصلاحی ہے، ان کے سماجی، سیاسی اور تعلیمی افکار و نظریات نے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور کر رہے ہیں، ان کی شاعری میں جہاں ماضی کی شاندار روایتوں کا بصیرت مندانہ تذکرہ ہے وہیں حال کا احتساب اور مستقبل کی تعمیر کا خاکہ بھی ہے، ان کے افکار میں فکر و عمل کی دعوت ہے، ان کا پیغام جہد مسلسل، فکر و نگاہ کی وسعت اور عزم وارادہ کی بلندی ہے۔ اس اکائی میں ان کے ذاتی حالات، تعلیم وتربیت کے مراحل، اور عملی مشاغل کے تذکرہ کے ساتھ ان کی شاعری، ان کے افکار و نظریات اور خدمات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ:

- علامہ اقبال کے حالات، ان کی علمی و تعلیمی خدمات اور ان کے افکار و نظریات سے واقف ہو سکیں۔
- ڈاکٹر محمد اقبال کی فکری شاعری اور اس میں پنہاں پیغامِ خودی وحیات سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

6.2 ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

ولادت اور تعلیم وتربیت

اقبال پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں 1877ء میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان کشمیری برہمنوں کا خاندان تھا، دوسو سال قبل ان کے اجداد میں سے ایک فرد نے اسلام قبول کیا تھا، ان کا خاندان ایک دیندار گھرانہ تھا، ان کی ولادت سے قبل ان کے والد نے ایک خواب دیکھا تھا جس میں ان کی آئندہ کی زندگی کی کامیابیوں اور کمالات کی طرف اشارہ تھا، خود ان کے والد شیخ نور محمد ایک بزرگ اور صوفی انسان تھے، اگرچہ زیادہ مالدار نہیں تھے لیکن شہر میں اپنی مذہبی اور اخلاقی پاکیزگی کی وجہ سے قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔

ان کے والد کا رجحان چونکہ تصوف کی جانب کافی تھا، اسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے ایک دینی ومذہبی ماحول میں تربیت پائی، ان کے والد نے ان کی دینی تربیت میں کوئی کمی نہیں رکھی، ناظرہ قرآن کی تعلیم ملا غلام حسن کے پاس شروع ہوئی، کم عمری سے ہی ان کے اندر قرآن کی تلاوت کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور روزانہ پابندی سے تلاوت قرآن کیا کرتے تھے، ان کی والدہ بھی ایک دیندار اور عبادت گزار خاتون تھیں، جس کا اقبال کی تربیت اور ان کے اخلاق و کردار پر بہت مثبت اثر پڑا۔

محمد اقبال کی ابتدائی تعلیم قدیم طرز پر مکتب سے شروع ہوئی، لیکن بعد میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے سیالکوٹ کے مشن اسکول میں داخل ہوئے، شروع سے ہی ذہین اور تعلیم میں نمایاں تھے، تمام درجات کے امتحانات میں اعلی نمبرات سے کامیاب ہوئے اور کئی درجات میں سرکاری وظیفہ کے ساتھ کامیابی حاصل کی، ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی رہی کے اسی اسکول میں فارسی اور عربی کے مدرس مولوی میر حسن مرحوم تھے، مولوی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے اچھے تعلیمی تعلقات قائم ہوگئے، مولوی صاحب موصوف کی شخصیت خالص علمی شخصیت تھی، ان کو عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد تھے، جنہیں وہ تعلیم کے دوران برملا پڑھا کرتے تھے، جس سے طلبہ میں اچھا خاصہ شعری ذوق پیدا ہو جاتا تھا، ادبیات ان کا خاص موضوع تھا، ڈاکٹر صاحب نے ان کی تعلیم و صحبت سے کافی فائدہ اٹھایا، ڈاکٹر اقبال کے اندر عربی و فارسی زبان کی جو صلاحیت پیدا ہوئی اور شعر و سخن کا جو ذوق پیدا ہوا وہ انہیں مولوی میر حسن مرحوم کی تعلیم اور صحبت کا نتیجہ ہے۔ اقبال آگے چل کر جب اردو اور فارسی میں شاعری کرنے لگے تھے تب اپنے انہیں استاد سے شاعری میں مشورہ اور اصلاح بھی لیا کرتے تھے، اقبال کی بنیادی شعری و فکری ذوق کی تشکیل اور منطق، فلسفہ اور لسانیات سے دلچسپی میں مولوی میر حسن کا بنیادی کردار رہا۔

علامہ اقبال کی اعلی تعلیم

اقبال نے 1891ء میں مڈل اور 1893ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیا، جس پر انہیں تمغہ اور وظیفہ سے بھی نوازا گیا، اس وقت اسکاچ مشن اسکول میں انٹر میڈیٹ کی کلاسز بھی شروع ہوگئیں اور اس کا نام اسکاچ مشن کالج ہو گیا، اس لئے انٹر کی تعلیم انہوں نے وہیں جاری رکھی، 1895ء میں انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے اقبال کو لاہور جانا پڑا۔

بی-اے کی ڈگری کے لئے اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا، انہوں نے انگریزی اور فلسفہ کے علاوہ عربی زبان وادب کا انتخاب کیا، اس لئے بعض کلاسز کے لئے انہیں اورینٹل کالج بھی جانا پڑتا تھا، یہ ڈگری انہوں نے 1897ء میں حاصل کی اور 1899ء میں فلسفے میں ایم-اے کیا، خوش قسمتی سے اس زمانہ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں مسٹر آرنلڈ پروفیسر تھے، ڈاکٹر اقبال نے بی-اے اور ایم-اے میں فلسفہ کا اختیاری مضمون لیا تھا، پروفیسر آرنلڈ کی صحبت میں فلسفہ کے موضوع سے انہیں خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی، 1904ء میں آرنلڈ ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس انگلستان چلے گئے تو اقبال کو اس کا بے حد افسوس ہوا، جس پر انہوں نے "نالۂ فراق" کے عنوان سے ایک نظم بھی کہی، جس میں انہوں نے اس علمی ذوق کا خاص طور پر ذکر کیا جو آرنلڈ کی صحبت میں انہیں حاصل ہوا تھا۔ اقبال نے ایم-اے کی تعلیم کے دوران ہی وکالت کا امتحان بھی پاس کرنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے تھے، اور بالآخر انہیں لندن جا کر وکالت میں کامیابی حاصل ہوئی۔

شعر گوئی کا آغاز

اقبال کی طبیعت کم عمری سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل تھی، سید میر حسن کی سرپرستی میں انہیں جو ماحول میسر آیا اس نے ان کے اندر شعر کہنے کا شوق پیدا کر دیا، میٹرک کے زمانہ سے ہی انہوں نے شاعری شروع کر دی تھی، میٹرک کے بعد وہ اپنی غزلیں رسالوں کو بھیجنے لگے، 1894ء میں ان کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس کا مقطع ہے

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے وہ بت گر اقبال　　حضرت داغ کے اشعار سنا دیتے ہیں

غالب گمان یہ ہے کہ اقبال 1894ء کے آس پاس داغ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو چکے تھے، داغ نے حیدرآباد میں اصلاح سخن کا دفتر قائم کر رکھا تھا جس کا باقاعدہ عملہ تھا اور ڈاک سے موصول ہونے والی غزلیں اصلاح دے کر واپس بھیجی جاتی تھیں، اقبال نے دوری کے باوجود داغ سے فیض اٹھایا اور 1896ء میں تو انہوں نے اس تعلق کا فخر کے ساتھ ذکر کیا

مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخن داں کا

اقبال اپنے استاد داغ سے ملاقات کا شوق رکھتے تھے مگر کبھی ملاقات ہو نہ سکی۔

کچھ عرصہ کے بعد علامہ اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور پہنچے تو اس علمی ادبی مرکز میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ابھرنے اور تربیت پانے کا سنہری موقع ہاتھ آیا، یہاں جگہ جگہ شعر و شاعری کی محفلوں کا چرچا تھا، مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظم لکھنوی جیسے پختہ کلام اور استادی کا مرتبہ رکھنے والے شاعر یہاں موجود تھے اور ان اساتذہ شعر نے ایک مشاعرے کا سلسلہ شروع کیا تھا، جو ہر ماہ بازارِ حکیماں میں منعقد ہوتا رہا، اقبال بھی اپنے شاعرانہ ذوق کی تسکین کی خاطر اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے، اس طرح مرزا ارشد گورگانی سے وہ بحیثیت شاعر کے متعارف ہوئے اور رفتہ رفتہ انہوں نے مرزا صاحب سے اپنے شعروں پر اصلاح بھی لینی شروع کر دی، اس زمانہ میں وہ صرف غزلیں کہا کرتے تھے۔، اور یہ غزلیں چھوٹی بحروں میں سادہ، خیالات کا اظہار لئے ہوئی تھیں، البتہ شوخی اور بے ساختہ پن سے اقبال کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار ضرور ہو جاتا تھا، بازار حکیماں کے ایک مشاعرے میں انہی دنوں اقبال نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے　　قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اس شعر کا سننا تھا کہ محفل مشاعرہ میں موجود سخن سنج اصحاب پھڑک اُٹھے اور مرزا ارشد گورگانی نے اسی وقت پیشن گوئی کی کہ اقبال مستقبل کے عظیم شعراء میں سے ہوں گے۔

شاعری کی شہرت

اقبال کی شاعری کا چرچا شروع شروع میں بازار حکیماں کے مشاعروں تک محدود تھا، یا پھر لاہور کے کالجوں کی ادبی مجالس میں انہیں شاعر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا، لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ شہر کی ادبی مجالس میں انہیں ایک خوش گو اور خوش فکر نوجوان شاعر کی حیثیت سے پہنچانا جانے لگا، انہی دنوں انہوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم پر بھی توجہ کی، ایک ادبی مجلس میں انہوں نے اپنی اولین نظم "ہمالہ" سنائی تو اسے بہت پسند کیا گیا، چنانچہ اقبال کی یہ پہلی تخلیق تھی جو اشاعت پذیر ہوئی، شیخ عبدالقادر نے اسی زمانہ میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے اپنا پہلا مشہور رسالہ "مخزن" جاری کیا تھا- اس کے پہلے شمارے میں اپریل 1901ء میں اقبال کی یہ نظم شائع ہوئی یہ گویا ان کی باقاعدہ شاعری کا آغاز تھا، ان کے پہلے مجموعہ کلام "بانگ درا" کی اولین نظم یہی ہے، اور اسی نظم کے چھپنے کے بعد ان کی شہرت روز بروز پھیلتی چلی گئی۔

جب اقبال انجمن حمایت اسلام کے بڑے بڑے جلسوں میں نظمیں پڑھنے لگے تو ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، 1900ء کے جلسے میں اقبال نے نظم "نالۂ یتیم" اپنے مخصوص انداز میں پڑھی اور سامعین پر سحر طاری کر دیا، 1904ء کے اجلاس میں اقبال نے نظم "تصویر درد" پڑھی تو حالی نے دس روپے بطور انعام کے دیئے، نظم کے اختتام پر خواجہ حسن نظامی ایسے بے اختیار ہوئے کہ انہوں نے اپنا عمامہ اقبال کے سر پر رکھ دیا۔

مسٹر آرنلڈ کی تعلیم وتربیت اور ان کی صحبت کے نتیجہ میں علامہ اقبال کے اندر اعلی تعلیم کا جو شوق پیدا ہوا تھا وہ بڑھتا ہی رہا، جس کی تکمیل کے لئے وہ خود یورپ جانا چاہتے تھے، لیکن ایم–اے ہونے کے بعد وہ پہلے اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاست کے لکچرار مقرر ہوئے، پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے، تین سال کی اس تدریس کے بعد یورپ میں اعلی تعلیم کے حصول کی خواہش میں لکچرر شپ سے استعفی دے دیا۔

6.2.1 یورپ کا تعلیمی سفر

1905ء میں ملازمت سے رخصت لیکر انگلستان کا رخ کیا، وہاں پہنچ کر کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا، وہاں ان کی ملاقات میک ٹگارٹ جیسے فلسفی سے ہوئی جو اس زمانہ میں فلسفی کی حیثیت سے بے حد شہرت حاصل کر چکا تھا، پھر فارسی ادب کے مشہور مؤرخ اے–جی براؤن اور "اسرار خودی" کے مترجم ڈاکٹر نکلسن سے ملاقات ہوئی، میک ٹگارٹ کے لکچرز سے انہوں نے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا سائنٹفک انداز سیکھا، براؤن اور نکلسن سے ملاقات کا انہیں یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے گھر پر فارسی کا جو علم حاصل کیا تھا اس میں پختگی آگئی۔ کیمبرج میں ان کا زیادہ تعلق پروفیسر وارڈ سالے اور پروفیسر براؤن سے رہا، کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفۂ اخلاق میں اور میونخ یونیورسٹی جرمنی سے "میٹافزکس آف پرشیا" یعنی ایرانی الٰہیات پر ایک مقالہ لکھ کر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی، پھر جرمنی سے واپس آکر لندن میں بیرسٹری کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگئے اور بیرسٹر بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، 6 مہینے تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے عربی کے لکچرار بھی رہے، اور اس زمانہ میں وہاں اقبال نے تقریر وخطابت کا مشغلہ بھی جاری رکھا، عام خطابات اور تقریروں کے علاوہ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ اسلام کی علمی وثقافتی تاریخ پر بھی لکچرز دیئے، پھر سیاسیات واقتصادیات میں امتیاز پیدا کرنے بعد 1908ء میں وطن واپس ہوئے۔

6.3 مغربی زندگی کے اقبال پر اثرات

اقبال فلسفیانہ دماغ رکھتے تھے، غور وفکر ان کا مزاج تھا، انہوں نے یورپ کے بے باک رنگین ماحول، آزاد فضاؤں اور مخلوط سماج میں وقت گزارا، لیکن اپنی بنیادی فکر اور تربیت کو کبھی فراموش نہیں کیا، آزادی کی بے راہ روی، مخلوط معاشرے کی تباہ کاریاں، وطنی قومیت کی خود غرضیاں کھلی آنکھوں دیکھیں، اقبال نے فرنگی تہذیب کی بنیادی کمزوریوں، اس کے دبتے ہوئے پہلوؤں اور اس عنصری فساد اور بگاڑ کو دیکھ لیا تھا، جو اس کی طبیعت اور بنیاد میں موجود ہے، انہوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب سے متاثر ذہن مذہب اور اخلاقی وروحانی اقدار کے

ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے، انہوں نے فساد قلب و نظر کو اس تہذیب کی روح کی ناپاکی کا ثمر بتایا ہے، جس نے اس سے قلب سلیم کی دولت چھین لی:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیر پاک و خیال بلند و ذوقِ لطیف

وطنی قومیت سے سرشار اقبال کا اب نشۂ قومیت اتر چکا تھا، اسلامی اخوت اور ملی قومیت نے وطنی قومیت کی جگہ لے لی تھی، جغرافیائی اتحاد کے بجائے اسلامی وحدت ان کا نصب العین بن چکی تھی، اسلام کے معاشرتی قانون اور اسلام کا شخصی کردار اس کی فکر کا حصہ بن چکے تھے، ایسے تمام انفرادی اور معاشرتی تصورات سے وہ دل برداشتہ ہو گئے تھے جو انسانی سعی و عمل کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں، کشمکش حیات میں فکری اور عملی کارکردگی کے حامی تھے، غرض یہ کہ یورپ کے مطالعے نے ان کے دل و دماغ اور فکر و نظر میں ایک مثبت انقلاب پیدا کر دیا تھا۔

اس دور مادیت اور مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک دمک سے اقبال کی آنکھیں خیرہ نہ ہو سکیں، حالانکہ اقبال نے یورپ کے مذہب بیزار اور آزاد ماحول میں وقت گزارا، اس کی وجہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اقبال کی وہی والہانہ محبت، جذبۂ عشق اور روحانی وابستگی تھی، اور بلاشبہ ایک حب صادق اور عشق حقیقی ہی قلب و نظر کے لئے ایک اچھا محافظ اور پاسبان بن سکتا ہے، اقبال کا یہ شعر اس سلسلہ میں بہت ممتاز ہے:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے — غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

مغربی تہذیب کے بارے میں کہتے ہیں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں — کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال سیالکوٹ سے لاہور منتقل ہو گئے اور وہاں عملی زندگی کا آغاز کیا، وکالت شروع کرنے کے بعد انہیں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ سے فلسفے کی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تاریخ کی لکچرر شپ کی پیش کش ہوئی مگر انہوں نے قبول نہیں کیا، اسی سال دوبارہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد کی ضرورت پیش آئی تو اقبال نے یہ ذمہ داری قبول کر لی، لیکن اس کے ساتھ وکالت بھی جاری رکھی۔ اسی طرح مختلف یونیورسٹیوں اور تعلیمی و تحقیقی اداروں کے لئے اپنی خدمات دیتے رہے، اور شاعری بھی جاری رکھی۔ ان کے اکثر اوقات غور و فکر، تصنیف یا شاعری میں صرف ہوتے تھے، وہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، اسی کے ایک جلسہ میں انہوں نے "شکوہ" اور دوسرے جلسہ میں "جوابِ شکوہ" پڑھی جو ایک قومی نظم کی حیثیت اختیار کر گئی اور جسے بے مثال مقبولیت ملی، انہی دنوں آپ نے "ترانۂ ہندی" اور "ترانۂ ملی" لکھا، دونوں ترانوں کو خوب شہرت حاصل ہوئی اور

دونوں قومی اور ملی محفلوں کے افتتاح کے لئے قومی ترانہ سمجھے جانے لگے۔

سر کا خطاب

شاعری میں علامہ اقبال کی شہرت پہلے ہی سے تھی اور اب یہ شہرت اور بھی زیادہ ہو گئی تھی، البتہ اس کا دائرہ صرف ہندوستان تک محدود تھا، لیکن یورپ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے اپنی شاعری کا رخ بالکل بدل دیا، پہلے وہ اپنے وطن کی زبان اردو میں قومی اور وطنی نظمیں لکھا کرتے تھے لیکن اب انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شاعری شروع کر دی، اور اس سلسلے میں سب سے پہلے ایک فلسفیانہ مثنوی "اسرار خودی" لکھی، جو 1915ء میں شائع ہوئی اور اس مثنوی کے لکھنے کے بعد انہوں نے ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی لیکن ہندوستان اور یورپ پر اس مثنوی کا اثر مختلف پڑا، اس مثنوی میں اقبال نے خودی کی تربیت اور تکمیل کے اصول بتائے اور جو فلسفہ یا تعلیم خودی کو ضعیف کرنے والی تھی اس کی تردید کی تھی، بطور خاص انگلستان میں اس مثنوی کو نہایت مقبولیت حاصل ہوئی اور 1918ء میں پروفیسر نکلسن نے جو اس سے پہلے دیوان شمس تبریز اور کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ کر چکے تھے، اقبال سے اس مثنوی کے ترجمہ کرنے کی اجازت چاہی اور اجازت کے بعد 1919ء میں جب یہ ترجمہ شائع ہوا تو غالباً پہلی بار مغربی دنیا اقبال کے خیالات سے واقف ہوئی اور بہت سے انگریز اہل علم نے ان کی طرف توجہ کی، مشہور نقاد ادب مسٹر اے۔ایم فارسٹر نے انگلستان کے نامور ادبی رسالہ ا تھینیتھم میں اس پر ایک مفصل تبصرہ کیا، اسی طرح کیمبرج کے پروفیسر ڈکسن نے رسالہ نیشن ویکلی میں اس مثنوی پر تبصرہ لکھا۔

اسی ترجمہ اور اس پر تبصروں سے اقبال کو یورپ میں جو شہرت حاصل ہوئی انگریزی گورنمنٹ پر بھی اس کا اثر پڑا اور اس نے جنوری 1923ء میں ان کو سر کا خطاب عطا کیا۔

6.4 اقبال کے سیاسی و علمی افکار

6.4.1 اقبال کا ملّی تصور

علامہ اقبال فرد کو قطرہ سے اور قوم کو دریا سے تشبیہ دیتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک قوم میں دریا ہی کی طرح وسعت بھی ہونی چاہئے، اور یہ وسعت صرف اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ قومیت کی بنیاد روحانی اصول پر قائم کی جائے، لیکن موجودہ دور میں ملک و نسب اور رنگ و روپ کے امتیازات کی بنا پر قومیت کا جو محدود نظریہ قائم کیا گیا ہے وہ وطنیت کے جغرافیائی حد بندی کے مادی تخیل سے پیدا ہوا ہے اس لیے اس نے دنیا کے سامنے ایک مادی بت کھڑا کر دیا ہے، جس کی پرستش دنیا کی تمام قومیں کر رہی ہیں اور دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ مسلمان بھی اس غیر اسلامی تصور کے فریب کا شکار ہیں، اقبال کہتے ہیں:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنالی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال کی شاعری میں ملی تصور کا آغاز سفر یورپ کے بعد یعنی 1908ء سے باضابطہ شروع ہوتا ہے، جب وہ یورپ میں تھے تبھی انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ یورپ کا جو ظاہری چہرہ ہے وہ کچھ اور ہے اور باطنی چہرہ کچھ اور ہے، قیام یورپ کے زمانہ میں ان کی شاعری میں ایک خوش آئند مگر عظیم انقلاب پیدا ہو گیا، انہوں نے مغربی تہذیب وسیاست کو بہت نزدیک سے دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں کے مفاسد ان پر بخوبی واضح ہو گئے، اور ان پر یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ قومیت ووطنیت بنی آدم کے حق میں کبھی مفید نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی بنیاد تعصب اور تنگ نظری پر ہے، اور مغربی تہذیب کی بنیاد مادیت پرستی اور خدا کے انکار پر ہے۔

اس عرصہ میں انہوں نے اسلامی اصول اور اسلامی تاریخ کا بہت غور وفکر کے ساتھ مطالعہ کیا، جب انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ آئندہ اپنی شاعری کو اسلامی مقاصد کے حصول کے لیے اور امت مسلمہ کی سربلندی کے لیے وقف کر دیں گے تو قدرتی طور پر ان کی شاعری میں "پیغام" کا رنگ پیدا ہو گیا، جو 1908ء سے لیکر 1938ء تک ان کی ہر تصنیف اور ہر نظم میں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی قوم کے اندر جوش وولولہ پیدا کرنے والی نظمیں لکھیں اور مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی سے آگاہ کیا، نظم صقلیہ اسی مقصد کے لئے لکھی گئی تھی، اسی طرح "بلاد اسلامیہ" کے نام سے لکھی ہوئی اپنی نظم میں قوم مسلم کی زبوں حالی اور شکست خوردگی پر آنسو بہاتے ہیں اور اس امید کا اظہار کرتے ہیں کہ اس تاریکی کے بعد صبح نو ضرور ہو گی جب اس امت کو بام عروج نصیب ہو گا۔

"ترانۂ ملّی" در اصل وطنیت (Nationalism) کے عقیدہ کی تردید ہے، پہلے اقبال پر وطن کی محبت کا تصور غالب تھا اور اسی تصور کے تحت انہوں نے "ترانۂ ہندی" نظم لکھی تھی، جب انہوں نے یورپ کا سفر کیا اور وہاں سے واپسی ہوئی اور انہوں نے یورپ میں وطنیت کے تعلق سے جو خرابیاں اور اس کی تباہ کاریاں دیکھیں تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ وطن کے نام پر لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آرہے ہیں، بالآخر وہ اس نظریہ سے رجوع کرکے خالص اسلامی نظریۂ وحدت وملیّت کی طرف مائل ہو گئے اور انہوں نے پھر "ترانۂ ملّی" کے نام سے نظم لکھی۔ اور ترانہ ہندی میں جو وطنیت کا تصور پیش کیا تھا اس کی جگہ ملیّت اور اسلامی وحدت کا نیا تصور پیش کیا، اس نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

چین وعرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اقبال نے اپنی اس فکر کے اظہار کے لئے متعدد نظمیں کہیں، اور مختلف عنوانات اور موضوعات کے تحت اپنی اس فکر کا اظہار کیا، ان نظموں میں سے چند اہم یہ ہیں: "وطنیت"، "شکوہ" اور "جواب شکوہ"، "خطاب بہ جوانانِ اسلام"، "غرہ شوال یا ہلال عید"، "شمع وشاعر"، "طلوع اسلام" اور "مسلم" وغیرہ۔

"حضور رسالت مآبؐ میں" ایک طرح سے بانگ درا کی جان ہے، اس نظم میں اقبال نے اپنے درد دل کا مکمل اظہار کیا ہے، مسلمانوں کے تمام دکھوں کا مداوا اس نظم میں نظر آتا ہے، تمام دنیا کے مسلمانوں کو انہوں نے ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ "**إنما المؤمنون إخوة**"۔ یعنی تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور پوری دنیا میں بسنے والی امت ایک جسم کی مانند ہے اور اس کا ایک ایک فرد جسم کے ایک ایک عضو کی طرح ہے۔

6.4.2 اقبال کے نزدیک ریاست کا تصور

اقبال محض سیاسی مفکر ہی نہ تھے بلکہ ہندوستان کی آزاد قومی اور وطنی ریاست کی تشکیل کے لیے ملک میں جو جدوجہد ہو رہی تھی اس کے عینی شاہد، اس میں شریک اور اقلیت کے موقف کے ترجمان اور اس کے خدوخال کے تعمیری نقاد تھے، اقلیت واکثریت کے حساس فرقہ وارانہ ماحول میں ان کی عملی سیاست کا محور بڑی حد تک مسلم اقلیت تھی، اس کا مستحکم دستوری تحفظ، مستقل اور منفرد تہذیبی وجود، باعزت زندگی، اس کے شہری اور وطنی حقوق کی حمایت ان کی سیاسی سرگرمیوں کا میدان تھے، جس میں وہ صرف راہی نہ تھے بلکہ قائد اور رہنما بھی تھے، ریاست کے متعلق ان کا اپنا خاص زاویۂ نظر تھا، موجودہ ریاستوں، ان کی تشکیل کے طریقوں، ان کے مقاصد، ان کے اقتدار اور ان کے طرز حکمرانی پر انہوں نے جو نقد کیا اس کا بیشتر حصہ اپنی جگہ تعمیری اہمیت کا حامل ہے، ریاست کے قومی، اشتراکی، راسمالی، لادینی اور کلیسائی جمہوریت واستبدادیت کے نظریوں پر وقتاً فوقتاً ان کی تنقید ایک نئے نظریۂ ریاست کی تشکیل کی ضرورت کا تقاضا تھی، مسلم اکثریت کے صوبے کی ہندوستان کے وفاق میں تشکیل کی تجویز پھر اس کے حصول کی جدوجہد اسی تقاضے کا عملی جواب تھا، اقبال کی یہ نصب العینی ریاست جو عالم انسانیت کی عام فلاح وبہبود ہے، اس کی ساخت میں انہوں نے ریاست کے مختلف نظریوں کو مدغم کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ریاست بیک وقت دینی بھی اور عہد حاضر کی دنیوی تقاضوں سے ہم آہنگ بھی، دوسرے لفظوں میں جمہوری بھی، یہ متحرک ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ بنیادی نقطوں پر جامد ہے، اس میں اخلاقی قدروں کی اپنی خاص جگہ ہے، ایک لحاظ سے یہ صرف مسلمانوں کی ملی ریاست ہے اور ایک لحاظ سے خالص انسانی اور آفاقی، اقبال کی یہ ریاست اپنے نصب العین، اپنے فرائض، اپنے طریق حکمرانی اور اپنے اصول ساخت کے اعتبار سے ''اسلامی ریاست'' ہے۔

6.4.3 علامہ اقبال اور تصوّف

اقبال کی ابتدائی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ تصوف اور دینی مسائل سے انہیں گہری دلچسپی پیدا ہو جاتی، یہی ہوا، اقبال میں اسلام کی محبت شروع ہی سے ایسی رچ بس گئی کہ عمر وعلم کے اضافے کے ساتھ اس میں پختگی پیدا ہوتی گئی، حتی کہ ان کی شخصیت رفتہ رفتہ ایک عظیم اسلامی مفکر کے سانچے میں ڈھل گئی، تصوف سے متاثر ہونے اور اس کی روحانی منزلوں کے قائل ہونے کے باوجود انہوں نے ایسے تصوف کے خلاف آواز بلند کی جو شریعت کی نفی کرتا ہو، یا جس سے قرآن ورسالت کے دیے ہوئے اصولوں پر ضرب پڑتی ہو، یہ حقیقت ہے کہ انہیں قرآن پاک اور آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک سے ایسی والہانہ وابستگی تھی کہ وہ زندگی کے مسائل پر غور وفکر کرتے وقت کسی ایسی بات کی تائید نہیں کرسکتے تھے جس سے توحید ورسالت کے عقیدے سے انحراف کی صورت پیدا ہوتی ہو۔

علامہ اقبال کی شاعری میں جس صوفیانہ مسلک کے آثار ملتے ہیں، وہ رسمی یا رائج تصوف نہیں، اس کی بنیاد خالص اسلامی تصوف اور اسلام کی حرکی روح (Dynamic Sprit) پر ہے۔ چنانچہ اقبال کا سارا کلام اسی Dynamic Sprit کی تشریح اور تفسیر ہے، اور یہی اقبال کے تصوف کا امتیازی نشان ہے، اس مسلک میں اقبال نے ان صوفیا سے اکتساب فیض بھی کیا ہے، جو زندگی کے اس مثبت نظریہ کے علمبردار ہیں اور خود بھی اپنے حکیمانہ نظریات سے اس نظریہ کو تقویت دی اور پروان چڑھایا۔

اقبال تصوف کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، انہوں نے صوفیانہ ادب سے خاصا استفادہ کیا ہے، شبستری کی "گلشن راز" کا جواب لکھا، یہاں تک کہ جلیل القدر صوفی شاعر و مفکر رومی ہی کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کیا اور مشہور صوفی حسین بن منصور حلاج کو "جاوید نامہ" میں بڑا رتبہ عطا کیا، بعض صوفی اکابر اور ان کی ارادات روحانی سے استناد بھی کیا اور ان کی صداقت کو تسلیم کیا۔ اسلام رہبانیت کا مخالف ہے، اقبال صوفیائے کبار سے اپنی عقیدت کے باوجود جہاں کہیں فکر و نظر کا کوئی پہلو غیر اسلامی اور منافی حیات دیکھتے ہیں وہاں بے باکانہ ان کی مخالفت بھی کرتے ہیں:

دمِ عارف، نسیم صبح دم ہے　　اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے
اگر گوئی شعیب آئے میسر　　شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اقبال عملی تصوف کے اس حصے کے منکر نہیں ہیں جس کا تعلق پاکیزگی، طہارت، حلال روزی کمانے، ریاکاری سے بچنے اور ان اخلاق وعبادات سے ہے جن کا ثبوت آنحضرت ﷺ کے عمل اور قرآن سے ملتا ہے، اقبال ان صوفیانہ تعلیمات کے خلاف تھے جو حیات کش اور عمل کی زندگی سے گریز سکھانے والی اور بے عملی کی تلقین کرنے والی تھیں۔

6.4.4 اقبال کا نظریۂ تعلیم

اقبال کو جدید تعلیم کو مذہب سے بیگانہ رکھنا گوارا نہیں تھا، الحاد سے ان کی یہ بیزاری محض دینداری کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس کے تحت چند فلسفیانہ تاریخی حقائق بھی پوشیدہ ہیں، زندگی محض علم کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے عمل بھی ایک ضروری چیز ہے اور انسان میں عمل کا جوش اور اس کا ولولہ صرف مذہب سے پیدا ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ تعلیم ایک اجتماعی چیز ہے، اس کا مقصد انتشار پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ اتحاد واتفاق پیدا کرنا ہے؛ لیکن چوں کہ ملت اسلامیہ کی بنیاد دینی اور روحانی اصول پر قائم ہے اس لئے جب تک اس کی تعلیم میں دینی اور روحانی عناصر شامل نہ ہوں اس کا اجتماعی وجود قائم نہیں رہ سکتا، موجودہ تعلیم سے جو الحاد پھیل رہا ہے اس سے سخت بیزاری ظاہر کرتے ہیں:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر　　لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم　　کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اقبال ایسی تعلیم کی پرزور تردید کرتے ہیں جس کا مطمح نظر صرف روزگار اور وسائل معاش کا حصول ہو، جس سے انسان میں زندگی کے بلند عزائم اور اعلی مقاصد پیدا نہ ہوتے ہوں، اقبال کی یہ سنجیدہ رائے ہے کہ تعلیم جدید نے نئی نسل کی صرف عقلی اور ظاہری تربیت سے اعتناء اور قلب وروح کی نشو ونما، روحانی ارتقا، اخلاق کی پاکیزگی اور تزکیۂ نفس سے غفلت کرکے اس پر سب سے بڑا ظلم کیا، وہ جب مسلم نوجوانوں کو اسلام کے بجائے دوسرے فلسفوں سے متاثر اور مرعوب دیکھتے ہیں تو فطری طور پر انہیں صدمہ ہوتا ہے، اقبال کی نگاہ میں اس ذہنی انحطاط کی ایک وجہ حد سے بڑھی ہوئی مادہ پرستی اور اسباب طلبی ہے، اور عہدوں، ملازمتوں، اونچی کرسیوں کو تعلیم کا مقصد اصلی سمجھنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بے مقصد افراد کے لیے علم دوائے نافع نہیں سمّ قاتل ہے، اور ایسی رزق سے موت بہتر ہے:

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

جس علم کو علامہ علم کی آخری منزل کہتے ہیں وہ گمان کا حاصل نہیں ایقان کا حاصل ہے، اور ایقان محض اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ انسانی ذات مربوط اور مکمل ہو یعنی حواس سے لیکر وجدان تک تمام صلاحیتیں ایک نقطہ پر مرتکز ہو جائیں، بندۂ مومن کے پاس ایقان ہوتا ہے جب کہ دوسروں کے پاس محض گمان، اقبال کی نظر میں اصل علم وہ ہے جس کی تصدیق دماغ اور دل دونوں سے ہو، جس میں مشاہدات حکیم اور تجلیات کلیم دونوں ہمکنار ہوں، وجدان کی تصدیق اور عشق کی تائید کے باعث علم قوت و حرکت و عمل سے بہرہ ور ہوتا ہے اور زندگی میں عملی طور پر جاری وساری ہوتا ہے، اقبال کے نزدیک ایسے علم کا کوئی تصور نہیں جو حرکی اور عملی نہ ہو، مگر حرکت و عمل کے معنی جاہ طلبی اور دنیاداری نہیں، اس کے معنی تسخیر کائنات اور تسخیر فطرت ہے یعنی آفاق پر انفس کی فتح ہے، آفاق پر انفس کی فتح ایسے ہی افراد حاصل کر سکتے ہیں جو شعورِ ذات رکھتے ہوں، انسانی زندگی کا ارتقا دراصل اسی شعورِ ذات کا ارتقا ہے۔

اقبال اور اجتہاد

حقیقت ہے کہ علامہ محمد اقبال نے اپنی زندگی کا طویل عرصہ اسلامی تہذیب وثقافت، اسلامی تاریخ اور اسلامی فکر و اصول و نظریات کے مطالعہ میں گزارا، جس کے نتیجہ میں انہیں اسلام کی اصل فکر کا فہم حاصل ہوا اور اس سلسلہ میں انہیں گہری بصیرت حاصل ہوئی۔ اقبال اسلام کی ابدیت اور حقانیت پر کامل یقین رکھتے تھے، اور ان کو یقین حاصل تھا کہ اسلام کا نظام قانون ابدی اور ہر زمانہ اور ہر قسم کے حالات میں رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن دنیا بھر کے ملکوں کی تہذیبوں اور ثقافتوں کو قریب سے دیکھنے اور عصر حاضر کے فکری اور تہذیبی چیلنج کو سمجھنے کے بعد وہ شدت سے اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ زمانے کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اسلام کی فکر، اس کے قوانین اور اس کے فلسفہ کی ایسی تشریح اور اس انداز میں ترجمانی کی جائے کہ جو جدید دنیا کے چیلنجز کا مقابلہ بھی کر سکے اور نئے ذہن کو اسلام کی طرف مائل بھی کر سکے، موجودہ دور کے سوالات کا اسلام تشفی بخش جواب دے سکے، اور آج کے زمانہ کے سماجی، سیاسی و فکری مسائل کا حل پیش کر سکے، جس سے اسلام کی یہ خصوصیت تمام قوموں کے سامنے واضح ہو سکے کہ اسلام کسی خاص علاقہ یا کسی خاص قوم کے لئے نہیں بھیجا گیا۔

لیکن بنیادی طور پر قدرت نے اقبال کو ایک دل درد مند عطا کیا تھا جو ملت اسلامیہ کی غلامی اور مغلوبیت پر کڑھتا تھا، خدا نے انہیں چشم بینا اور روشن دماغ عطا کیا تھا، وہ فکر و نظر کی دنیا کو پرکھنے کے لئے اپنے فلسفیانہ دماغ سے ملت اسلامیہ کے زوال کے اسباب و محرکات کا جائزہ لے سکتے اور اس کا تجزیہ بھی کر سکتے تھے، انہیں اس بات کا ادراک تھا کہ ماضی کی تاریخ سے بے جا عقیدت اور اس کے مصنوعی احیا سے ملت کے زوال اور انحطاط کا علاج نہیں ہو سکتا، ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کی آزادی اور احیا کے لئے اولاً سیاسی غلامی کی زنجیروں کو توڑنا ہو گا اور پھر نو آزاد مملکتوں کی تعمیر کے لیے انفرادی درجے کے اجتہاد کے بجائے اجتماعی کے ادارے قائم کرنا ہو گا، مستقبل کی جدید آزاد اسلامی ریاستوں کے لیے وہ اس اجتہاد کا وجود اور وجوب پارلیمنٹ کو قرار دیتے ہیں جسے ثقہ علمائے دین کی رہنمائی میسر ہو، ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کے احیا اور بقا دونوں کا راز اجتہاد کے بند دروازے کو کھولنے میں مضمر ہے، اپنے اس احساس کو وہ ایک علامتی شعر میں یوں بیان

کرتے ہیں:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند　　اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

علامہ اقبال کی شخصیت بحیثیت ایک مفکر کے بہت نمایاں اور ممتاز ہے، وہ بنیادی طور پر فکر اسلامی کے نقیب اور اس کے پر جوش ترجمان تھے، انہوں نے علم و فکر کی تجدید کی دعوت دی، موجودہ دور کے الحادی اور مادہ پرستانہ افکار و نظریات سے مقابلہ کے لئے انہوں نے جدید علم کلام کی تشکیل پر بھی زور دیا اور اس کا خاکہ بھی پیش کیا، اسلام پر تہذیبی و فکری لحاظ سے امت اسلامیہ کا اعتماد از سر نو بحال کرنے کی کامیاب کوشش کی، اپنے فلسفیانہ و مفکرانہ دلائل، تاریخی حوالوں اور مضبوط عقلی و نقلی اور شرعی و منطقی طرز فکر سے اہل علم اور اصحاب عقل و شعور کے ذہنوں کو اپیل کیا، اور امت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے نہایت بیش قیمت عملی و فکری سرمایہ عطا کیا، اپنی بلند آہنگ شاعری کے ذریعہ اقبال نے افسردہ دلوں میں ایک جان ڈال دی اور امید، بلند ہمتی، عزم و استقلال، بلند نگاہی اور ایمان و یقین کا لافانی درس دیا، اقبال نے اپنی شاعری اور موثر انداز و اسلوب کے ذریعہ عقل اور دل دونوں کو بیک وقت متاثر کیا۔

علامہ اقبال کی تصنیفات

اردو کلام کے مجموعے: بانگ درا-1924ء، بال جبریل-1935ء، ضرب کلیم-1936ء، ارمغان حجاز (حصہ اردو) 1938ء

فارسی کلام کے مجموعے: اسرار خودی-1915ء، رموز بے خودی-1918ء، پیام مشرق-1923ء، زبور عجم 1927ء، جاوید نامہ-1932، مسافر-1934، مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق-1936، ارمغان حجاز-1938

نثری تصانیف: علم الاقتصاد-1904، The Development of Metaphysics in Persia

The Reconstruction of Religious Thought in Islam، Six Lectures

علامہ اقبال 21 اپریل 1938ء مطابق 20 صفر 1357ء کو طویل علالت کے بعد اپنے گھر جاوید منزل لاہور میں انتقال فرما گئے اور لاہور کی بادشاہی مسجد کے پہلو میں سپرد خاک کئے گئے۔

6.5 فرہنگ

بے ساختہ : غور و فکر کیے بغیر، بلا تصنع، بلا ارادہ، برجستہ

سخن سنج : کلام کو جاننے اور سمجھنے والا، کلام کو پرکھنے والا، شاعری کے نکات سے واقف

مطمح نظر : مقصد اصلی، مقصود، نقطۂ نظر، مرکز نگاہ

وحدت : ایک ہونا، واحد ہونا، اتحاد، ایک ہونے کی کیفیت، یکجہتی

6.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- علامہ اقبال ایک بلند پایہ شاعر، فلسفی، ماہر قانون اور مصلح تھے۔
- علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایسے افکار پیش کئے جنہوں نے پوری قوم کو متاثر کیا اور ان کو دعوت فکر و عمل دیا۔
- اقبال نے مسلم نوجوانوں کو ماضی کی عظمتوں کے گیت بھی سنائے، حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر کا راز بتایا۔
- اقبال نے اپنی طاقت ور فکر اور موثر شاعری کے ذریعہ امت مسلمہ کو قرآن اور اسلامی طرز حیات سے وابستہ ہونے کی تلقین کی۔

6.7 نمونہ امتحانی سوالات

6.7.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. علامہ اقبال کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(a). کشمیر (b). لاہور (c). سیالکوٹ (d). دہلی

2. علامہ اقبال کی قبر کس شہر میں ہے؟

(a). ممبئی (b). لاہور (c). کلکتہ (d). کراچی

3. اس میں کون سی تصنیف علامہ اقبال کی نہیں ہے؟

(a). بانگ درا (b). بال جبریل (c). ضرب کلیم (d). فاروق

4. علامہ اقبال کو کس استاد کی صحبت میں سب سے پہلے فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوئی؟

(a). پروفیسر آرنلڈ (b). پروفیسر براؤن (c). پروفیسر نکلسن (d). پروفیسر میک ٹگارٹ

5. علامہ اقبال کو سر کا خطاب کب ملا؟

1915.(a) 1930.(b) 1923.(c) 1905.(d)

6. جاوید نامہ کس زبان میں ہے؟

(a). عربی (b). فارسی (c). اردو (d). پنجابی

7. علامہ اقبال کس سے اپنی شاعری کی اصلاح لیا کرتے تھے؟

(a). ذوق (b). حالی (c). داغ (d). غالب

8. مولوی میر حسن مرحوم کو کس موضوع سے زیادہ دلچسپی تھی؟

(a).ریاضی (b).شعروشاعری (c).تاریخ (d).سماجیات

9. اسرارخودی کاانگریزی ترجمہ کس نے کیاتھا؟

(a).آرنلڈ (b).براؤن (c).نکلسن (d).علامہ اقبال

10. اقبال کی وفات کس سنہ میں ہوئی؟

(a).1925ء (b).1947ء (c).1915 (d).1938ء

6.7.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. علامہ اقبال کی ابتدائی تعلیم پر روشنی ڈالیے۔
2. علامہ اقبال کے تصور ریاست پر مختصراً روشنی ڈالیے۔
3. علامہ اقبال کے سفر یورپ کی روداد اختصار کے ساتھ قلم بند کیجیے۔
4. علامہ نے شعر گوئی کا آغاز کس طرح کیا؟ مختصر تحریر کیجیے۔
5. اقبال کے نظریۂ تعلیم پر مختصر نوٹ لکھیے۔

6.7.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. اقبال اور تصوف کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. اقبال کے نزدیک تصورِ ملی کا جائزہ تفصیل سے لکھیے۔
3. اجتہاد سے متعلق اقبال کی فکر پر تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔

6.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اقبال کامل از مولانا عبدالسلام ندوی، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ 2009ء
2. اقبال: شاعر و مفکر از نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 2000ء
3. افکارِ اقبال از محمد عبدالسلام خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1991ء
4. معارف فکر اقبال از طالب حسین ہاشمی، بک کارنر جہلم پاکستان 2020ء

معروضی سوالات کے جوابات

1. C	2. B	3. D	4.A	5.C
6. A	7. C	8. B	9. C	10. D

اکائی 7: اشرف علی تھانوی

اکائی کے اجزا:

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 مولانا اشرف علی تھانوی

7.2.1 سوانحی خاکہ

7.2.2 تعلیم و تربیت سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر

7.2.3 تعلیم و تربیت کا مقصد

7.2.4 خواتین کی تعلیم سے متعلق مولانا کا نقطہ نظر

7.2.5 مولانا اشرف علی تھانوی کا سیاست سے متعلق نقطہ نظر

7.2.6 تصوف سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر

7.2.7 مولانا اشرف علی تھانوی اور اجتہاد و تقلید

7.3 فرہنگ

7.4 اکتسابی نتائج

7.5 نمونہ امتحانی سوالات

7.5.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

7.5.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

7.5.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

7.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

بیسویں صدی کے عظیم مصنف و مصلح کی حیثیت مولانا اشرف علی تھانوی کی رہی ہے، آپ کی زندگی کی جہتیں مختلف تھیں، آپ ایک معلم بھی تھے، اور ایک واعظ و خطیب بھی، ایک مصنف بھی تھے تو ایک مرشد و مصلح بھی، آپ مسلم سماج کی کمزوریوں اور برائیوں سے بھرپور واقف بھی تھے تو ایک حکیم اور دانا کی طرح ان برائیوں کے خاتمہ اور ازالہ کے طریقوں سے واقف بھی تھے اور ہر مسئلہ سے متعلق آپ کی ایک فکر تھی اور ایک واضح نظریہ تھا، جس پر آپ نے اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں روشنی ڈالی ہے اور اس کے نکات سے گفتگو کی ہے۔ اگر آپ کی فکری جہتوں اور نوعیتوں کی درجہ بندی کریں تو درج ذیل اہم عناوین سامنے آتے ہیں:

1- تعلیم و تربیت، 2- تصوف، 3- سیاست، 4- تقلید و اجتہاد۔

ان اہم عناوین کے تحت مختلف ذیلی عناوین ہیں، جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر مسئلہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے اور اپنی تحریر و تقریر میں اس کا اظہار فرماتے تھے۔

مزید برآں آپ کے شاگردوں اور مریدوں نے آپ کی فکری اور اصلاحی کوششوں کو دنیا کے مختلف ملکوں اور علاقوں تک وسعت دی۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ:

- مولانا اشرف علی تھانوی کے افکار و نظریات اور ان کی اصلاحی خدمات سے واقف ہو سکیں۔
- برصغیر میں ان کی فکری و اصلاحی کاوشوں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔
- درس و تدریس، وعظ و خطابت اور بیعت و ارشاد کے ذریعے معاشرتی برائیوں اور بدعات و خرافات کے خاتمے کے لیے ان کی کوششوں اور ان کے دوررس اثرات کا جائزہ لے سکیں۔

7.2 مولانا اشرف علی تھانوی

7.2.1 سوانحی خاکہ

مولانا اشرف علی تھانوی ضلع مظفر نگر اتر پردیش۔ یوپی کے ایک قصبہ تھانہ بھون میں 1280ھ مطابق 9 ستمبر 1863 عیسوی کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی، یوپی کے شہر میرٹھ میں قرآن کریم حفظ کیا اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، پھر تھانہ بھون واپس آئے اور مولانا فتح محمد صاحب سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند سہارنپور یوپی میں داخلہ لیا اور 1301 ہجری میں فضیلت کی سند حاصل کی۔

اپنی ظاہری و باطنی اصلاح کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت ہوئے اور ریاضت و مجاہدہ کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے، درس و تدریس کے لئے مدرسہ فیض عام کانپور کا انتخاب کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، 14 سال تک اسی مدرسہ میں درس دیتے رہے، پھر وہاں سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن تھانہ بھون واپس آ گئے اور تصنیف و تالیف اور بیعت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خانقاہ کو از سرے نو آباد کیا اور مدرسہ اشرفیہ کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔

جن لوگوں نے اپنی ظاہری و باطنی اصلاح کے لئے آپ سے رجوع کیا وہ اپنے وقت کے مختلف میدانوں کی نامور شخصیات تھیں، جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مفتی محمد شفیع اور مولانا ابرار الحق ہردوئی وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان حضرات کے علاوہ ہزاروں لوگ آپ سے بیعت ہوئے اور اپنی اصلاح کی۔

مولانا اشرف علی تھانوی ایک عظیم مصنف بھی تھے، آپ کی تصنیفات کی تعداد سو سے متجاوز ہے، جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ جن میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں: بیان القرآن، اشرف الجواب، بوادر النوادر، اصلاح الرسوم، اغلاط العوام، احکام اسلام عقل کی نظر میں، الحیلۃ الناجزہ للحلیلۃ العاجزہ۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ، عوام کی اصلاح و تربیت کے لئے آپ نے وعظ وارشاد کا سلسلہ بھی جاری کیا، چنانچہ آپ کے مواعظ اور ملفوظات کی تعداد سو جلدوں کے قریب ہیں۔

آپ کی وفات 16 رجب 1362 ہجری مطابق 20 جولائی 1943 کو ہوئی، آپ کی نماز جنازہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے پڑھائی، اور تھانہ بھون کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

7.2.2 تعلیم و تربیت سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر

تعلیم و تربیت سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کا مقصد انسان کو آدمی بنانا ہے، اگر تعلیم و تربیت سے انسان آدمی نہیں بن پاتا ہے، تو پھر تعلیم و تربیت اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہے۔

الافاضات الیومیہ میں مولانا اشرف علی تھانوی کا یہ قول منقول ہے:

"بزرگ بننا آسان ہے، مگر انسان بننا بڑا مشکل، میرے یہاں آدمیت کی تعلیم ہوتی ہے"۔

اسی طرح مولانا کا یہ قول بھی انتہائی اہم ہے کہ شاہ صاحب بننا آسان ہے، ملک التجار بننا آسان ہے، بزرگ بننا آسان ہے، قطب بننا آسان مگر انسان بننا مشکل۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے تعلیم آدمیت کی وضاحت بھی کی ہے، آپ نے فرمایا: تعلیم آدمیت سے مراد اصلاح احوال ہے۔ اور آدمیت کا خلاصہ آپ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "آدمیت کا حاصل یہ ہے کہ اپنے سے دوسروں کو اذیت نہ پہنچے"۔

7.2.3 تعلیم وتربیت کا مقصد

مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ آدمیت کی تشکیل کے بعد ضروری ہے کہ صالح معاشرہ کا وجود عمل میں آئے، چنانچہ معاشرہ کی اصلاح اور صالح معاشرہ کے قیام کے لئے آپ نے بھرپور کوششیں کیں اور معاشرہ پر پڑی رسوم ورواج اور بدعات وخرافات کی دبیز چادروں کو ہٹا کر معاشرہ کی تجدید کا کام کیا اور اس میدان میں کامیابی نے آپ کے قدم چومے، چنانچہ آپ خود فرماتے تھے:

مجدد ملت تو خیر کیا، لیکن مجدد معاشرت میں ضرور ہوں۔

صالح معاشرہ کو وجود میں لانے کے لئے آپ نے تین کام کئے:

1. لوگوں کے شعور کو بیدار کرنے کے لئے پند وموعظت کا سلسلہ شروع کیا، آپ کے خطبات ومواعظ اس کثرت سے ہوتے کہ آپ کے مواعظ کتابی شکل میں خطبات حکیم الامت کے نام سے ستائیس جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔
نیز آپ کے منتشر ملفوظات اور بیانات اصلاح امت کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔
اسی طرح اشرف السوانح کے ایک باب کا عنوان ہی اصلاح معاشرت ہے۔
2. خطبات ومواعظ اور پند ونصائح کے علاوہ مولانا نے بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی شروع کیا اور مختلف لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے تزکیہ باطن کیا اور پھر آپ کے مجاز وخلفاء اور مریدین نے اصلاح معاشرہ کے اس سلسلہ کو دنیا کے مختلف خطوں تک دراز کیا۔
3. آپ نے عوام کی اصلاح اور صالح معاشرہ کے قیام سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں چند مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں: اغلاط العوام، بہشتی زیور اور الحیلۃ الناجزہ وغیرہ۔
مزید برآں مولانا اشرف علی تھانوی کا معمول یہ تھا کہ درس وتدرس سے زیادہ توجہ تہذیب اخلاق پر دیتے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

"مجھ کو علم کے پڑھانے لکھانے کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں ہے، جس قدر تہذیب اخلاق ودیانت کا، کیونکہ لکھنے پڑھنے کا اہتمام تو ہر جگہ ہوتا ہے، لیکن اخلاق کی طرف کسی کا خیال بھی نہیں"۔

نیز فرماتے ہیں:

"کسی سے کوئی حرکت خلاف تہذیب سرزد ہو، اس کا اس لئے اچھی طرح تدارک کیا جاتا ہے کہ اس میں اوروں کو تکلیف ہوتی ہے"۔

مولانا اشرف علی تھانوی تعلیم وتربیت میں انسانی نفسیات واحساسات کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد میاں صدیقی لکھتے ہیں:

مولانا تھانوی نے لوگوں کی تعلیم و تربیت اور ذہنی و فکری اصلاح کا جو طریقہ اپنایا وہ عام ڈگر سے ہٹ کر تھا، ان کا طریقہ کار انسانی جبلت و فطرت اور نفسیات کے عین مطابق تھا۔

مولانا اشرف علی تھانوی طلبا کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

بس تم تین باتوں کا التزام کر لو، پھر میں ٹھیکہ لیتا ہوں اور ذمہ دار ہوتا ہوں کہ تمہیں استعداد علمی حاصل ہو جائے گی: اول یہ کہ جو سبق پڑھنا ہو، اس کا مطالعہ ضرور کر لیا جائے، اور مطالعہ مشکل کوئی کام نہیں، کیونکہ مطالعہ کا مقصود صرف یہ ہے: معلومات اور مجہولات متمیز ہو جائیں، بس اس سے زیادہ کاوش نہ کرے، دوم پھر سبق کو استاد سے اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لے، بلا سمجھے آگے نہ چلے، اگر اس وقت استاد کی طبیعت حاضر نہیں، تو دوسرے کسی وقت سمجھ لے، سوم اس کے بعد ایک بار خود بھی مطلب کی تقریر کرے، بس ان تینوں التزامات کے بعد پھر بے فکر رہے، چاہے یاد رہے یا نہ رہے، ان شاء اللہ استعداد ضرور پیدا ہو جائے گی، یہ تینوں باتیں تو درجہ وجوب میں ہیں اور ایک بات درجہ استحباب میں ہے، وہ یہ ہے کہ کچھ آموختہ بھی روزانہ دہرا لیا کرے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا انگریزی زبان کے تعلق سے یہ خیال اور مشاہدہ تھا کہ انگریزی زبان کی تعلیم کے بعد لوگوں پر انگریزی تہذیب کا اثر غالب ہو جاتا ہے، اور لوگ دین کے فرائض سے بھی غافل ہو جاتے ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

آج کل تعلیم جدید کے متعلق علما پر اعتراضات کیا جاتا ہے کہ یہ تعلیم جدید سے روکتے ہیں، حالانکہ میں کہتا ہوں کہ اگر تعلیم جدید کے یہ آثار نہ ہوتے جو علی العموم اس وقت اس پر مرتب ہو رہے ہیں، تو علما ہر گز اس سے منع نہ کرتے۔

ایک مجلس میں آپ نے ارشاد فرمایا: انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کے عقائد متاثر ہو رہے ہیں، جس سے ان کے ایمان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

البتہ جب مولانا کو انگریزی تعلیم کی افادیت کا اندازہ ہوا، تو آپ نے انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے تین چیزوں کو ضروری قرار دیا:

1. اول اپنے مذہب کی تعلیم حاصل کرو، کسی عالم کے مشورہ سے کورس مقرر کرو۔
2. دوسرے علما کی صحبت میں آمد و رفت کو۔
3. تیسرے غیر جنس کی کتابوں سے احتراز کرو اور علما حقانی کی کتابیں مطالعہ میں رکھو۔

7.2.4 خواتین کی تعلیم سے متعلق مولانا کا نقطہ نظر

مولانا اشرف علی تھانوی عورتوں کی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں: میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں، مگر اس تعلیم کا ضرور مخالف ہوں جو یہ لوگ عورتوں کو دیتے ہیں۔

چنانچہ آپ نے عورتوں کی تعلیم کے مقصد سے بہشتی زیور لکھا، جس میں زندگی کے ان تمام شعبوں سے متعلق احکام و مسائل لکھے،

جن کا جاننا عورتوں کے لئے بے حد ضروری ہے، اس کتاب میں مولانا نے احکام و مسائل کے علاوہ اسلامی تاریخ، خانگی امور اور طبابت جیسے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

نیز مولانا نے کتاب کے شروع میں خوش خط لکھنے کے قواعد کے ساتھ خطوط نویسی کے آداب بھی لکھے ہیں۔

البتہ مولانا اشرف علی تھانوی مغربی تہذیب کی تعلیم و تعلم کو مرد و عورتوں کے لئے یکساں طور پر مضر سمجھتے تھے۔

عورتوں کے پردہ کے تعلق سے مولانا کا نقطہ نظر یہ تھا کہ پردہ عورتوں کی تعلیم و ترقی کے لئے رکاوٹ کے بجائے مددگار اور معاون ہے، آپ فرماتے تھے:

تعلیم یافتہ ہونے یا غیر تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں، بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے، اگر کسی قوم کو عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردے میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں، ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا، بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے، کیونکہ تعلیم کے لئے یکسوئی اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے، اور وہ گوشہ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

7.2.5 مولانا اشرف علی تھانوی کا سیاست سے متعلق نقطہ نظر

اسلام نے جس طرح زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہدایات دی ہیں اور اصول وضابطے مقرر کیے ہیں۔ سیاست سے متعلق بھی اصول مقرر کیے ہیں اور بعض معاملات سے متعلق تو تفصیلی ہدایت دی ہیں۔ سیاست اور شریعت کے تعلق سے مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ شریعت اور سیاست کے درمیان تلازم ہے، دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

جس طرح طریقت کو شریعت سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح شریعت اور سیاست کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اللہ تعالی کے احکام کو نافذ کرنے میں حکومت معاون ہوتی ہے۔

آپ فرماتے ہیں: "حکومت کو فروغ دین سہل ہے"۔

البتہ آپ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ حکومت اسلام کا مقصد نہیں ہے، بلکہ حکومت دین کے احکام کے نفاذ کا وسیلہ ہے، مولانا فرماتے ہیں: دیانات مقصود بالذات ہے اور سیاست و جہاد مقصود اصلی نہیں ہے۔

7.2.6 تصوف سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر

تصوف سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تصوف شریعت کا پانچواں جز ہے، آپ فرماتے ہیں:

"شریعت" کے پانچ اجزاء ہیں، پانچواں جز تصوف ہے، جسے شریعت میں اصلاح نفس کہتے ہیں، آج کل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوف کے لیے بیوی، بچوں اور دوسری دنیاوی امور کو چھوڑنا پڑتا ہے، یہ بالکل غلط ہے، یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے، جو تصوف کی حقیقت کو نہیں جانتے۔

تصوف کے سلسلے میں آپ کے اس قول سے بھی آپ کے نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

حقیقت تصوف کی صرف علم بالعمل ہے اور عمل وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے اور جو سالک کے اختیار میں ہے، اس کے علاوہ سب چیزیں زائد ہیں۔

ایک جگہ آپ فرماتے ہیں: تصوف کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہی نماز، روزہ تصوف ہے، اور یہی اعمال مقصود ہیں، مجاہدہ کی ضرورت صرف نماز روزہ کو نماز روزہ بنانے کے لئے ہے۔

ایک جگہ آپ فرماتے ہیں: تصوف کا خلاصہ صرف علم مع العمل ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی تحریروں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تصوف مولانا کے نزدیک شریعت پر عمل ہی کا نام ہے۔

تصوف کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

تصوف کا مقصد نفس کی اصلاح اور دل کی صفائی ہے، لیکن بعد میں تصوف میں باہر سے اتنی چیزیں آگئی ہیں کہ تصوف کا مقصد پس پردہ چلا گیا ہے۔

تصوف کے مقاصد پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

اصل مقصد حق تعالی کو راضی کرنا ہے، جس کا ذریعہ ہے شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا، ان حکموں سے بعض متعلق ظاہر کے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ..... اور بعض متعلق باطن کے ہیں، جیسے خدا سے محبت رکھنا، خدا سے ڈرنا، خدا کو یاد رکھنا، دنیا سے محبت نہ ہونا، خدا کی مشیت پر راضی رہنا، حرص نہ کرنا، عبادت میں دل کا حاضر رکھنا، دین کے کاموں کو اخلاص سے کرنا، کسی کو حقیر نہ سمجھنا، خود پسندی نہ کرنا، غصہ کو ضبط کرنا، وغیرہ اس اخلاق کو سلوک کہتے ہیں۔

مولانا کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تصوف ان کیفیات کو پیدا کرنے کا نام ہے، جن کو قرآن نے تزکیہ سے تعبیر کیا ہے اور احادیث میں احسان، زہد اور رقاق جیسے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صوفیا سلوک کی راہ طے کرنے اور باطن کی اصلاح کے لئے بیعت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ بیعت کا مطلب ہے عہد وپیماں یعنی باطن کی اصلاح کا طالب کسی مرشد کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے اور عہد وپیمان کرتا ہے کہ وہ فرائض کی ادائیگی کی پوری کوشش کرے گا اور حرام چیزوں سے اجتناب کرے گا، یہی بیعت کی اصل اور روح ہے۔

کتب احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام بھی اس طرح کی بیعت کیا کرتے تھے، چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی فرماتے ہیں: میں نے نماز کے قائم کرنے، زکاۃ کے ادا کرنے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر حضرت محمد ﷺ سے بیعت کی۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی نقطہ نظر یہ ہے کہ تصوف میں بیعت ضروری ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ یقین صحیح ہے کہ بیعت طریقت کی ضرورت عام نہیں ہے، لیکن اس میں دھوکہ ہوتا ہے کہ باوجود اس

خاص حالت کے پھر بھی نفس میں بعض امراض خفیہ ہوتے ہیں کہ وہ بدون تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتا،اس لئے تعلق شیخ ہی سے ضروری ہوتا ہے۔

ایک جگہ بیعت کی ضرورت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نفس میں کچھ امراض ہوتے ہیں ،ان کا علاج کتابوں میں لکھا ہے، لیکن پھر بھی طبیب کی ضرورت ہوتی ہے،اسی درجہ نفسانی امراض کے معالجہ میں شیخ یعنی معلم کی ضرورت ہوتی ہے۔

بیعت کے لئے یہ ضروری ہے کی سلوک کا طالب کسی ایسے مرشد کا انتخاب کرے جو کامل ہو۔

مولانا مرشد کامل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تو پہچان اس کی یہ ہے کہ وہ شریعت کا ضروری علم رکھتا ہو،کسی شیخ کامل کی تربیت کے خلاف پر اصرار نہ کرتا ہو،سنت کا پابند ہو،اپنے متعلقین پر شفقت کرتا ہو،احتساب میں کمی نہ کرتا ہو، جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں وہ کامل ہے۔

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے نزدیک بیعت شیخ کامل کے ہاتھوں پر ہی کی جاسکتی ہے،اور شیخ کامل کے لئے ضروری ہے کہ دین کے ضروری احکام سے واقف ہو اور اپنے مریدوں کا احتساب بھی کرتا ہو اور غلط باتوں پر تنبیہ بھی کرتا ہو۔

7.2.7 مولانا اشرف علی تھانوی اور اجتہاد و تقلید

اسلام ایک آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے،جو رہتی دنیا تک پوری دنیا کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث کے نصوص محدود ہیں، جب کہ روز بروز پیدا ہونے والے مسائل غیر محدود ،اس لئے اجتہاد کا جاری رہنا اور ہر نو پید مسائل کو حل کرنے کے لئے اجتہاد کرنا ایک ضروری امر ہے۔البتہ ان اصول و قواعد کی اتباع کرنا ضروری ہے،جو سلف صالحین اور ائمہ کرام سے منقول ہو، تاکہ انسان نفس کی خواہشات اور سہولت پسندی سے محفوظ رہتے ہوئے احکام کی پابندی کرے۔

اجتہاد کا مفہوم:

اجتہاد کا لفظ جہد سے مشتق ہے، جس کے معنی مشقت و کلفت کے ہیں۔ اس لئے کسی ایسے کام میں پوری پوری کوشش صرف کرنے کو اجتہاد کہتے ہیں، جس میں مشقت و کلفت ہو۔

شریعت کی اصطلاح میں اجتہاد یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی تحقیق کے لئے وہ آخری درجہ کی سعی کی جائے کہ بظاہر اس سے زیادہ سعی اور کوشش ممکن نہ ہو۔

تقلید کا مفہوم:

تقلید لغت میں قلادہ ڈالنے کو کہتے ہیں، اونٹ کے گلے میں قربانی کے لیے جو علامت کے طور پر پٹہ ڈالا جاتا ہے،اس کو بھی تقلید کہا جاتا ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں تقلید اس شخص کی بات کو دلیل و حجت طلب کیے بغیر مان لینے کا نام ہے، جس کی رائے بذات خود حجت شرعی نہیں ہے۔ اس تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کے علاوہ کسی شخص کی بات کو دلیل طلب کیے بغیر تسلیم کر لینے کو تقلید کہتے ہیں۔

چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی نے اجتہاد اور تقلید دونوں پر ہی گفتگو کی ہے، اور اعتدال کا راستہ اپنایا ہے۔

چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

اجتہاد سے جس طرح حکم کا استنباط جائز ہے، اسی طرح اجتہاد سے حدیث کو معلل سمجھ کر مقتضائے علت پر عمل کرنا، جس کا حاصل احکام وصفیہ کا تعین ہے، مثل احکام تکلیفیہ کے یا احد الوجوہ پر محمول کرنا یا مطلق کو مقید کر لینا اور ظاہر الفاظ پر عمل نہ کرنا حدیث کی مخالفت یا ترک نہیں ہے، اس لئے ایسا اجتہاد بھی جائز ہے، اور ایسے اجتہاد کی تقلید بھی جائز ہے.

مولانا اشرف علی تھانوی کے اس اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

1. قرآن وحدیث کے نصوص میں اجتہاد اور غور وفکر کر کے حکم معلوم کرنا اور حکم کا استنباط کرنا جائز ہے۔
2. اجتہاد اور غور وفکر کر کے علت نکالنا اور اس علت کے مطابق حکم معلوم کر کے اس پر عمل کرنا جائز ہے۔
3. اور اس علت کے مطابق فرض، واجب، سنت حرام یا مکروہ کا حکم لگانا یا کسی حدیث کا حکم مطلق ہے تو اس کو مقید کرنا یا علت کی وجہ سے نصوص قرآن وحدیث کے ظاہری معنی پر عمل نہ کرنا یہ سب جائز ہیں، اسی طرح اس کی تقلید کرنا بھی جائز ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کتاب الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد میں مختلف احادیث سے دلائل بھی ذکر کئے ہیں اور اپنے نقطہ نظر کو ثابت کیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں: حکم غیر منصوص محتمل وجوہ مختلفہ میں مجتہد کے لیے اجتہاد اور غیر مجتہد کے لیے تقلید جائز ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے تقلید کے جائز ہونے پر متعدد احادیث سے استدلال کیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی تقلید کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: کسی کا قول محض اس حسن ظن پر مان لینا کہ یہ دلیل کے موافق بتلائے گا اور اس سے دلیل کی تحقیق نہ کرنا۔

تقلید کے جواز پر مولانا نے صحابی کے عمل سے استدلال کیا ہے، مولانا فرماتے ہیں:

سلیمان بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری حج کے لیے نکلے، جس وقت مکہ کی راہ میں جنگل میں پہنچے تو اونٹنیاں کھو بیٹھے اور یوم النہر میں جب کہ حج ہو چکا تھا، حضرت عمر کے پاس آئے اور یہ سارا قصہ بیان کیا، آپ نے فرمایا: جو عمرہ والے کیا کرتے ہیں، اب تم بھی وہی کرو۔

مولانا اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو صحابہ اجتہاد نہ کر سکتے تھے وہ مجتہدین صحابہ کی تقلید کرتے تھے۔

اجتہاد پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا اشرف تھانوی لکھتے ہیں: جس شخص کو قوت اجتہاد حاصل نہ ہو اس کو اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں اور ممکن ہے کہ ایک شخص حافظ حدیث ہو اور مجتہد نہ ہو۔

مولانا نے اپنے اس قول کی تائید میں حضرت عدی بن حاتم کی حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔ کی عام تفسیر کرتے ہوئے ایک ڈوراسفید ایک ڈوراسیاہ لے کر رکھ لیا۔

اس پوری حدیث کو نقل کرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں: باوجود یکہ یہ صحابی اہل زبان تھے، مگر بوجہ قوت اجتہاد نہ ہونے کے فہم مراد قرآن میں غلطی کی، کیونکہ ان کی غلطی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعنوان مزاح انکار فرمایا۔

تقلید شخصی پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا اشرف علی لکھتے ہیں: تقلید شخصی ثابت ہے۔ آگے مزید لکھتے ہیں: اس زمانے میں بہ اعتبار غالب حالات لوگوں کے تقلید شخصی ضروری ہے۔ اور آگے ضروری کی تشریح وجوب سے کی ہے، مطلب یہ ہے کہ مولانا اشرف علی کے نزدیک تقلید شخصی واجب ہے۔

تقلید میں افراط و تفریط درست نہیں ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جس طرح تقلید کا انکار قابل ملامت ہے، اسی طرح اس میں غلو وجمود بھی موجب مذمت ہے۔ تقلید میں افراط و تفریط کی وضاحت مولانا کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تقلید مجتہد کی اس کو شارح وبانی احکام سمجھ کر نہیں کی جاتی بلکہ اس کو مبین احکام اور موضع شرائع ومظہر مراد اللہ ورسول اللہ اعتقاد کرکے کی جاتی ہے، پس جب تک کوئی امر منافی ورافع اس اعتقاد کا نہ پایا جائے گا اس وقت تک تقلید کی جاوے گی اور جس مسئلہ میں کسی عالم وسیع النظر، ذکی الفہم، منصف مزاج کو اپنی تحقیق سے یا کسی عامی کو کسی ایسے عالم سے بشرطیکہ متقی بھی ہو بشہادت قلب معلوم ہو جاوے کہ اس مسئلہ میں راجح دوسری جانب ہے تو دیکھنا چاہیے کہ اس مرجوح جانب میں بھی دلیل شرعی سے عمل کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر گنجائش ہو تو ایسے موقع پر جہاں احتمال فتنہ و تشویش عوام کا ہو اور مسلمانوں کو تفریق کلمہ سے بچانے کے لیے اولی یہی ہے کہ اس مرجوح جانب پر عمل کرے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی اس تحریر سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

کسی مجتہد کی تقلید اس لیے نہیں کی جاتی کہ وہ مجتہد نبی ہے، یا شریعت سازی کا اس کو اختیار حاصل ہے، بلکہ اس اعتقاد سے کی جاتی ہے کہ اللہ نے یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم دیا ہے مجتہد اس کو بیان کرنے والا اور واضح کرنے والا ہے۔

اگر کسی عالم کو جو وسیع النظر ہو، معلوم ہو کے کسی مسئلہ میں مجتہد کے قول کے بالمقابل دوسرا قول راجح ہے تو بھی اگر مجتہد کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے تو مجتہد ہی کے قول پر عمل کیا جائے گا، تاکہ فتنہ پیدا نہ ہو اور عوام تشویش میں مبتلا نہ ہو۔

7.3 فرہنگ

تلازم : وابستگی، باہم لازم ہونا

رقاق : مزاج کی نرمی، نرم

کلفت : ذہنی اذیت دینے والی فکر، رنج، تکلیف، مشقت، بے چینی

محتمل : احتمال کیا گیا، گمان کیا گیا، ظنی، مشتبہ، قیاس کیا ہوا

7.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- دور جدید کے ایک عظیم مفکر و مصلح کے حالات زندگی اور مختلف میدانوں میں ان کی خدمات سے واقف ہوئے۔
- تعلیم سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے نظریات سے آپ واقف ہوئے کہ تعلیم کا مقصد آدمی بنانا ہے کہ اس سے کسی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے، اور نیک اور صالح معاشرہ کا قیام ہو سکے۔ نیز معلم کو چاہئے کہ دوران تعلیم طالب علم کے نفسیات کا خیال رکھے، اور آپ اس بات سے بھی واقف ہوئے کہ مولانا عورتوں کی تعلیم کے مخالف نہیں ہیں، اور نہ پردہ کو تعلیم کے لئے رکاوٹ سمجھتے ہیں، بلکہ مولانا کا خیال یہ ہے کہ پردہ تعلیم کے لئے معاون ہے، کیوں کہ پردہ سے یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔
- آپ مزید اس بات سے بھی واقف ہوئے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سیاست دین سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ دین کا ایک حصہ ہے، نیز مولانا کا خیال یہ بھی ہے کہ حکمرانوں کے لئے دین کا فروغ اور اس کی اشاعت سہل ہے
- اسی طرح آپ اس سے بھی واقف ہوئے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کے نزدیک تصوف شریعت کا ایک حصہ ہے۔ اور مولانا کے نزدیک تصوف کا مقصد نفس کی اصلاح اور دل کی صفائی ہے۔
- اجتہاد و تقلید کے مفہوم سے آپ واقف ہوئے۔ اجتہاد و تقلید سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے نقطہ نظر سے آپ واقف ہوئے کہ مولانا کے نزدیک قرآن وحدیث کے نصوص میں اجتہاد اور غور و فکر کرکے حکم معلوم کرنا اور حکم کا استنباط کرنا جائز ہے۔
- اجتہاد اور غور و فکر کرکے علت نکالنا اور اس علت کے مطابق حکم معلوم کرکے اس پر عمل کرنا جائز ہے۔ اور اس علت کے مطابق فرض، واجب، سنت حرام یا مکروہ کا حکم لگانا یا کسی حدیث کا حکم مطلق ہے تو اس کو مقید کرنا یا علت کی وجہ سے نصوص قرآن وحدیث کے ظاہری معنی پر عمل نہ کرنا یہ سب جائز ہیں، اسی طرح اس کی تقلید کرنا بھی جائز ہے۔
- جس شخص کو قوت اجتہاد حاصل نہ ہو اس کو اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں اور ممکن ہے کہ ایک شخص حافظ حدیث ہو اور مجتہد نہ ہو۔
- مولانا اشرف علی تھانوی کے نزدیک اس زمانے میں بہ اعتبار غالب حالات لوگوں کے تقلید شخصی ضروری ہے۔

7.5 نمونہ امتحانی سوالات

7.5.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. مولانا اشرف علی تھانوی کی سن پیدائش کیا ہے؟

(a).1880 (b).1905 (c).1863 (d).1977

2. اشرف الجواب کے مصنف کا نام بتائیے۔

(a).ابوالاعلی مودودی (b).سرسید (c).ابوالکلام آزاد (d).اشرف علی تھانوی

3. مولانا اشرف علی تھانوی خواتین کی تعلیم کے مخالف تھے۔

(a).درست ہے (b).غلط ہے

4. "حکومت کو فروغ دین سہل ہے" یہ کس کا قول ہے؟

(a).سید قطب (b).جمال الدین افغانی (c).حسین احمد مدنی (d).اشرف علی تھانوی

5. مولانا اشرف علی تھانوی کن کے خلیفہ تھے؟

(a).قاسم نانوتوی (b).رشید احمد گنگوہی (c).امداداللہ مہاجر مکی (d).یعقوب نانوتوی

6. مولانا اشرف علی تھانوی نے کس مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دیئے؟

(a).مدرسہ فیض عام کانپور (b).دارالعلوم دیوبند (c).دارالعلوم ندوۃ العلما (d).مدرسہ امینیہ دہلی

7. مولانا اشرف علی تھانوی کے نزدیک تعلیم کا مقصد کیا ہے؟

(a).مہذب شہری بنانا (b).انسان کو آدمی بنانا (c).حکومت کے اہل بنانا (d).ان میں سے کوئی نہیں

8. مولانا اشرف علی تھانوی تعلیم کے لیے پردہ کو رکاوٹ سمجھتے تھے؟

(a). صحیح (b).غلط

9. مولانا اشرف علی تھانوی کی تاریخ وفات بتائیے۔

(a).1970 (b).1943 (c).2005 (d).1920

10. مولانا اشرف علی تھانوی کے نزدیک شریعت کا پانچواں جز کیا ہے؟

(a).سیاست (b).معیشت (c).تصوف (d).عبادت

7.5.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. مولانا اشرف علی تھانوی کی زندگی پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. صالح معاشرہ کے قیام سے آپ کیا سمجھتے ہیں، وضاحت کیجیے۔
3. خواتین کی تعلیم سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نظریہ بیان کیجیے۔
4. سیاست سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کا نظریہ بیان کیجیے۔
5. تصوف سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے نقطہ نظر کی وضاحت کیجیے۔

7.5.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. مولانا اشرف علی تھانوی کی حیات و خدمات پر ایک مضمون لکھیے۔
2. تعلیم سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے فکر و نظر سے بحث کیجیے۔
3. تصوف اور سیاست سے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی کے نقطہ نظر پر ایک مضمون لکھیے۔

7.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اشرف السوانح : عزیز الحسن مجذوب اور مولوی عبد الحق
2. بیس بڑے مسلمان : مرتبہ مولانا عبد الرشید ارشد
3. حکیم الامت نقوش و تاثرات : مولانا عبد الماجد دریابادی
4. ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا اشرف علی تھانوی افکار کا تقابلی مطالعہ : ایم فل اقبالیات مقالہ نگار محمد یونس مینو
5. الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد : مولانا اشرف علی تھانوی

معروضی سوالات کے جوابات

1. C	2. D	3. B	4.D	5.C
6. A	7. B	8. B	9. B	10. C

اکائی 8: ابوالکلام آزاد

اکائی کے اجزا:

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 حالات زندگی

8.2.1 ابتدائی حالات

8.2.2 مولانا کے اخلاقی اور ذاتی حالات

8.2.3 ادبی و علمی زندگی کے حالات

8.2.4 سرگرم سیاسی زندگی کے حالات

8.2.5 مولانا کی وفات

8.3 مولانا آزاد کی صحافتی خدمات

8.4 مولانا آزاد کی تفسیری خدمات

8.5 مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی خدمات

8.6 فرہنگ

8.7 اکتسابی نتائج

8.8 نمونہ امتحانی سوالات

8.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

8.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

8.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

مولانا ابو الکلام آزاد اپنے وقت کی ایک عبقری شخصیت تھے، آپ نے تنہا اتنا کام کیا ہے جتنا پورا ایک ادارہ اور انجمن مل کر کرتی ہے، وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، علم کی وسعت اور تنوع انسائیکلوپیڈیا جیسا تھا، عملی میدان میں زبان بیان دونوں کے ماہر تھے، نثر و نظم دونوں ہی میں طبع آزمائی کی، علم کے آسمان میں ایک کہکشاں کی طرح تھے، ادب، سیاست، سماجیات، قرآنیات و دینیات، زبانوں میں اردو، عربی، فارسی غرض متعدد موضوعات پر ماہرانہ انداز میں کام کیا ہے، وہ اپنی افتاد طبع، اپنے فکر و تصور، اپنے رجحانات و میلانات میں تنوع رکھتے تھے، بیک وقت ان کے جملہ خصائص کا احاطہ کرنا مشکل ہے، اگر وہ کسی ایک میدان میں ٹھہر جاتے تو اس میدان کے امام شمار ہوتے۔

ذہانت کے ساتھ ساتھ بے پناہ حافظہ کے مالک، کتابوں کے دوست، مطالعہ کے مجنون، گمشدہ اسلاف کی یادگار، عیب بینی اور عیب چینی سے متنفر، قرآن کے مفسر، آزادی کی جدوجہد کے سالار، مستقبل کے نباض، بولتے تو پھول جھڑتے، مطالب کے فرش پر الفاظ کا رقص ہوتا، چاروں طرف سحر پھیل جاتی، 1857ء کے بعد آپ کی شخصیت نے مسلمانوں کو عمل کے میدن کی طرف بلایا اور خوف و رعب سے باہر نکلنے کی دعوت دی۔

آپ نے ایک مخصوص عقائد و افکار کے ماحول میں آنکھیں کھولیں، آپ کے لئے ایک خاص طرح کی تربیت کا سارا سامان مہیا کیا گیا، لیکن ان کی فطرت سلیم نے اس ماحول کا اثر اور تربیت قبول کرنے سے انکار کر دیا،، تقلید و رسوم کی بندشوں کو توڑ دیا، آباء و اجداد کے طریق کے بجائے خود اپنا راستہ بنایا اور ایک ایسے میدان کا انتخاب کیا جس نے آپ کی شخصیت کو تاریخ میں ہمیشہ ہمیش کے لئے درج کر دیا۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ہے کہ آپ:

- مولانا ابو الکلام آزاد کے حالاتِ زندگی اور ان کی تاریخی صحافتی خدمات سے واقف ہو سکیں۔
- ان کی ہمہ جہت و عبقری شخصیت کے مختلف علمی، فکری اور سیاسی پہلوؤں کا مطالعہ کر سکیں۔
- آزادی کے بعد آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے ان کے تعلیمی و قومی کارناموں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

8.2 حالات زندگی

قد طویل نہ قلیل، متوسط القامت، اکہرا بدن، نازک الجثہ، سرخ و سپید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، آخری عمر میں رنگ دار عینک کے شیشے ان کا غلاف تھے، اسی طرح پیشانی کی شکنوں اور آنکھوں کی لہروں سے پتہ چلانا مشکل تھا کہ ان کے ذہنی پس منظر میں کیا ہے، چہرہ کتابی،

داڑھی کچی، آواز میں جمال وجلال، عجم کے حسن طبیعت اور عرب کے سوزدروں کی تصویر، طبیعت باغ وبہار، فطرت کم آویز، مزاج میں سطوت، عوام سے بے نیاز، خلوت پسند، فقر واستغناء کے پیکر، صبر جمیل کا مجسمہ، گفتگو کے بادشاہ، علم کے بحر ناپید کنار، خطابت کے شہسوار اور قلم کے دھنی، یہ تھی مولانا ابوالکلام آزاد کی سیرت وصورت کی ایک مختصر تصویر۔

8.2.1 ابتدائی حالات

مولانا آزاد کا سلسلہ نسب شیخ جمال الدین سے ملتا ہے، شیخ جمال الدین ایک ممتاز عالم دین اور بزرگ تھے، اکبر کے دور حکومت میں آپ ہندوستان کے شہر آگرہ تشریف لائے، بعد میں دہلی میں سکونت پذیر ہوئے، شہنشاہ اکبر آپ کی علم، سچائی اور بزرگی سے متاثر تھا، لیکن جب اکبر کے دور حکومت میں دین الٰہی کے فتنہ نے سر اٹھایا تو آپ نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور حق پر قائم رہے۔

آپ کے والد کا نام خیر الدین اور والدہ کا نام عالیہ بیگم تھا، والد پشتینی دہلوی تھے، مشہور کوچہ پنڈت کے رہنے والے تھے، 1857ء کے غدر کے بعد انہیں وطن چھوڑنا پڑا اور حجاز کی طرف ہجرت کرلی، مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش مکہ میں 1888ء میں ہوئی، آپ کا اصل نام محی الدین احمد تھا جو بعد میں کئی مراحل سے گزر کر ابوالکلام آزاد ہو گیا، ان کے والد انہیں فیروز بخت بھی پکارتے تھے، آپ کی تین بہنیں اور ایک بڑے بھائی ابو نصر غلام یسین تھے۔

آپ کا بچپن مکہ اور مدینہ میں بسر ہوا، مکہ میں آپ کے والد کا مکان دینی تعلیم کا ایک بڑا مرکز تھا، ابتدائی تعلیم آپ نے والد سے ہی حاصل کی، مکہ چھوڑنے سے پہلے ناظرہ قرآن مکمل کرلیا، کئی ایک سورتیں بھی زبانی یاد کرلی تھیں، حرم میں اس وقت شیخ حسن سب سے بڑے قاری تھے، ان سے قرأت کا سبق لیا، اس کے بعد مولوی نذیر حسین امیٹھوی، شمس العلماء سعادت حسن اور دیگر علماء سے بھی استفادہ کیا، مولانا محمد حسین شاہ سے ترمذی شریف کا درس لیا، اسی طرح درس نظامیہ سولہ یا پندرہ سال کی عمر میں ہی مکمل کرلیا، لکھنو کے مشہور طبیب باقر حسین سے طب سیکھی۔

مولانا جب سات برس کے تھے تبھی آپ کے والد ہندوستان کلکتہ منتقل ہو گئے، آپ کے والد کا تعلق تصوف اور خانقاہ سے تھا، آپ بڑے پایہ کے صوفی اور بڑے مقبول اور ہر دلعزیز پیر تھے، کلکتہ اور بمبئی کے اطراف میں ان کے مریدوں کی ایک خاصی بڑی تعداد تھی، اپنے بڑے بیٹے کو اپنی جانشینی کے لئے تیار کر رہے تھے، مگر اکیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا، آپ کے والد پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا، بڑے بیٹے کے انتقال کے بعد وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنے راستے پر چلانا چاہ رہے تھے اور ان کو توجہ اور تخلیہ کی تلقین کرتے تھے، ابتدا میں مولانا کی طبیعت کا رنگ بدلا، اور عام دوستوں کی صحبتوں کو خیر آباد کہہ دیا، جب مولانا خیر الدین کا انتقال ہوا تو ان کے مریدوں نے آپ کو سجادہ نشین بنانا چاہا، مگر اس وقت تک مولانا کی طبیعت بدل چکی تھی اور وہ تصوف سے بے زار ہو چکے تھے، مولانا نے حجرے میں بیٹھنے والی زندگی کو پسند نہیں کیا۔

بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق تھا، لہذا مختصر سی ہی عمر میں مختلف علوم میں مہارت حاصل کرلی تھی، دس سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے آپ کتابوں کی رسیا ہو گئے، اردو، فارسی، عربی، ترکی، علم نجوم، طب اور قرأت وغیرہ علوم پر دسترس حاصل ہو گئی تھی، آپ کی علمی

وسعت کو دیکھ کر لوگ حیرت واستعجاب میں مبتلا ہو جاتے تھے ، آپ کے والد بچوں کی تربیت کے سلسلے میں بہت سخت تھے، گھر کی چہار دیواری سے باہر جانے کے اجازت نہیں تھی، غالبا یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنا مشغلہ کتب بینی کو بنالیا، اگرچہ اپنی خاندانی روایت کے مطابق انہوں نے دینی تعلیم حاصل کی تھی، لیکن وہ اسی پر مطمئن نہیں ہو گئے، انہوں نے وسیع اور گوناگوں مطالعہ سے اس میں اضافہ کیا، اور دوسروں کی تقلید پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے غور وفکر سے اپنی ایک الگ راہ نکالی، حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ محفوظ ہو گیا، آپ کی شادی ابتدائی عمر میں ہی ہو گئی تھی، آپ کے والد کے مریدوں میں ایک صاحب مولوی آفتاب الدین تھے، ان کا ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں تھیں، ان میں سے ایک بچی کا نکاح آپ کے بڑے بھائی ابو نصر سے ہوا، سب سے چھوٹی بیٹی زلیخا بیگم کا نکاح آپ سے ہوا، 1942ء مولانا کی زوجہ محترمہ کا اس وقت انتقال ہوا جب آپ احمد نگر کے قلعہ میں قید تھے، آپ نے زندگی میں بہت سارے اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن اس حادثہ سے آپ جتنے افسردہ ہوئے کسی اور سے نہ ہوئے۔

8.2.2 مولانا کے اخلاقی اور ذاتی حالات

آپ ہمیشہ وقت کے بڑے پابند رہے، کھانے اور سونے کے معمول میں بھی نظام الاوقات میں خلل گوارہ نہ تھا، آپ شروعات میں خوش خوراک تھے، آخری عمر میں غذائیت کم ہو گئی تھی اور دوپہر کا کھانا بھی بند کر دیا تھا، انوع واقسام کے کھانے کا شوق نہ تھا، جو بھی آسانی سے دستیاب ہو جاتا کھالیتے، آپ کے معمول میں تھا کہ صبح تین یا چار بجے اٹھ جاتے تھے، صبح کی چائے خود ہی بناتے، نوکروں کو اس کی تکلیف نہیں دیتے تھے، رات میں جلد کھانا کھا کر دس بجے تک سو جاتے، آپ حد درجہ خلوت پسند تھے، کسی کے ہاں نہ جاتے اور نہ کسی کو بلاتے، اسی وجہ سے معاصرین آپ سے ناراض رہتے، پابندی اوقات کا یہ عالم تھا کہ ایک دن پانچ بجے شام گاندھی جی آ گئے، مولانا کو خبر ملی تو اپنی جگہ سے ہلے نہیں، فرمایا اس وقت ملنے سے معذور ہوں، کل صبح نو بجے تشریف لائیں، گاندھی جی بھی ہشاش بشاش لوٹ گئے، اور اگلے دن نو بجے تشریف لائے۔

آپ خوش پوشاک تھے، مشرقی لباس جو علماء کا لباس ہے پہننا پسند کرتے تھے، ابتدا میں ترکی کا یورپین لباس پہنتے تھے، الہلال کے ابتدائی دور تک عمامہ بھی باندھتے، پھر شیروانی پہننی شروع کر دی، کانگریس میں آئے تو کھدر کا لباس پہننے لگے، آخر میں کھلی قمیص، تنگ پیجامہ اور چست شیروانی میں منتقل ہو گئے، آپ صوم وصلاۃ کے پابند تھے، جیل میں ہوں یا بڑے بڑے اجلاس میں جب کبھی نماز کا وقت آتا تو اٹھ کر چلے جاتے، قرآن کریم سے خصوصی شغف تھا، جب کہیں تلاوت سنتے تو آپ پر گریہ وزاری کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ مولانا نے کبھی بھی شرافت نفسی اور غیرت مندی کا دامن نہیں چھوڑا، تحریک پاکستان کے دوران لیگیوں نے آپ سے انتہائی زیادہ بدسلوکی اور بدتمیزی کی، لیکن مولانا کبھی بھی غصہ میں آپے سے باہر نہیں ہوتے اور حد درجہ ان کی بات کا جواب دینے سے اجتناب کرتے، ہر بات ناپ تول کر کرتے، افراط وتفریط اور غیض وغضب سے دور رہتے، آپ معاملات میں صفائی رکھنا فرض جانتے تھے، جس سے قرض لیتے اس کو مقرر تاریخ پر چیک بھیجوا دیتے، بصورت دیگر جب تک قرض ادا نہ کر لیتے بے چین رہتے۔ مولانا چاہتے تو ان کے لئے روپئے پیسے کی کمی نہ تھی، اکثر ہندو، مسلم اور پارسی آپ کے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگانے کے لئے تیار رہتے تھے، لیکن آپ کسی کی مالی مدد قبول نہ کرتے،

انتہائی محتاجگی کے دوران قرض لے لیتے، اور پیسہ آنے کے بعد اسے فوراً لوٹا دیتے، تقریباً دس سال وزارت میں رہے، وفات پائی تو جو کپڑے پہنے تھے ان میں پیوند لگے ہوئے تھے، اور بینک بیلنس صرف چند روپے تھا، سفارشوں سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے، بے جا سفارش کو مستحقین کی حق تلفی گردانتے تھے، ایک بار ان کے بہنوئی نے خواہش کی وہ کلکتہ کارپوریشن کے چیف ایگزیکوٹو افسر بننا چاہتے ہیں اور مولانا سے سفارش کی درخواست کی، لیکن مولانا نے سختی سے مسترد کر دیا۔

8.2.3 ادبی و علمی زندگی کے حالات

ابتدائی عمر ہی سے ادبی زندگی کا آغاز کر دیا تھا، جب آپ کی عمر بمشکل گیارہ برس کی تھی شعر گوئی شروع کر دی تھی، لہذا شروع میں داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی، مگر دو یا تین غزلوں کے بعد امیر مینائی کی شاگردی اختیار کر لی، پھر ان کو بھی چھوڑ کر مولانا محمد ظہر احسن شوق نیموی سے اصلاح لی، شاعری سے آپ نے کافی شہرت حاصل کی، آپ نے اردو اور فارسی دونوں ہی زبانوں میں شاعری کی، مشاعروں کا چسکہ پڑ گیا اور ہر مشاعرے میں داد حاصل کرتے، شاعری میں آزاد تخلص اختیار کیا، اور مولوی ابو الکلام آزاد دہلوی ہو گئے، شاعری نے آپ کی خطابت کو ایک نیا رنگ دے دیا، اردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار آپ کو یاد تھے، اسے آپ اپنی خطابت میں برجستہ استعمال کرتے تھے، شاعری سے ہی آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا، لیکن شعر گوئی کے لئے بہت زیادہ سنجیدہ نہیں ہوئے اور بہت جلد شاعری سے آپ کا دل اچاٹ ہو گیا، غالباً انہیں یہ محسوس ہو گیا تھا کہ شاعری ان کا میدان نہیں ہے، لسان الصدق جب 1903ء میں جاری کیا تو شاعری سے تقریباً دستبردار ہو گئے، لہذا وہ پھر شاعری چھوڑ کر نثر نگاری کی طرف متوجہ ہو گئے۔

20 نومبر 1903ء میں ایک ماہوار پرچہ "لسان الصدق" جاری کیا، اس جریدہ کا مقصد جیسا کہ انہوں نے خود اس میں لکھا تھا، سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی اصلاح کرنا، ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کو وسیع کرنا، علمی مذاق کی اشاعت، تنقید یعنی اردو تصنیفات پر منصفانہ ریویو تھا۔ اس وقت مولانا کی عمر پندرہ برس کی تھی، یہ بھاری مقصد اس عمر میں محض ایک دعوی نہیں تھا بلکہ آنے والے دنوں میں اس پرچہ نے ان مقاصد کی مکمل نمائندگی کی، اپنے مضمون کے معیار اور دلکش انداز تحریر کی وجہ سے جلد ہی یہ پرچہ صف اول کے پرچوں میں شامل ہو گیا، اور آپ کی شہرت دور دراز تک پھیل گئی، اجنبی شخص جب آپ کی تحریریں پڑھتا تو اسے کوئی بڑا، عمر دراز اور طویل تجربہ کا حامل عالم سمجھتا تھا، لیکن آپ نے کم سنی ہی میں یہ شہرت حاصل کر لی تھی۔

مولانا آزاد اپنے عہد کے ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے، بچپن ہی میں گھر والوں کے ساتھ تقریر کی مشق کرتے تھے، انہوں نے خطابت کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا، اپنی تقریروں میں قوم کو بیداری، سیاسی شعور، ملت کی اصلاح اور ملک کی آزادی کی بات کی، نوجوانی میں ہی آپ بحیثیت خطیب بھی مشہور ہو چکے تھے، مولانا کی تحریر اور ان کی تقریر ان کی تحریر ہوتی، وہ گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا کہ کتاب کے ورق الٹ رہے ہوں، تقریر نہایت مربوط اور مرتب ہوتی، طبی نسخوں کے اجزا کی طرح ایک ایک لفظ ناپ تول کر بولتے، عبد الرزاق ملیح آبادی کہتے ہیں کہ آپ کو جب املا کرنا ہوتا تو بولتے جاتے اور میں لکھتا جاتا، ہر روز یہی طریقہ کار تھا، جہاں چھوڑ دیتے، اگلے دن یہ معلوم کئے بغیر کہ کہاں چھوڑا تھا اگلا حصہ لکھوانا شروع کر دیتے، جس طرح لکھتے تھے اسی طرح بولتے تھے، پر شکوہ الفاظ، پر ہیبت فقرے، قرآن کی

آیات اور برجستہ اشعار، پھر وقت کے ساتھ جیسے جیسے قلم بدلتا رہا ویسے ویسے زبان میں تغیر آتا رہا۔ انجمن حمایت اسلام اس دور کا مشہور ادارہ تھا، اس کے سالانہ جلسے ہوا کرتے تھے، اہل انجمن صاحب علم حضرات کو دعوت دے کر تقریر کے لئے بلایا کرتے تھے، 1904ء کے سالانہ جلسے میں آپ کو تقریر کے لئے لاہور بلایا گیا، لوگ آپ کو غائبانہ میں ایک عمر رسیدہ بزرگ عالم سمجھتے تھے، مگر جب سامنے پندرہ سولہ سال کے اس لڑکے کے سامنا ہوا تو لوگوں کو بہت ہی حیرت ہوئی، اسی موقع پر مولانا حالی سے آپ کی ملاقات ہوئی، کم سنی میں اس علمی معیار کو دیکھ کر مولانا حالی آپ کو بہت پسند کرتے تھے، اور ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے۔

8.2.4 سرگرم سیاسی زندگی کے حالات

مولانا نے ایک ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں تھیں جہاں ہر طرف مریدوں کا ہجوم لگا رہتا تھا، بنگال و ممبئی میں لاکھوں مرید تھے، پیسوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی، والد صاحب کے انتقال کے بعد جانشینی آپ ہی کے حصے میں آئی، آسانی سے آپ عیش کی زندگی گزار سکتے تھے، لیکن ان سب چیزوں سے آپ بے زار تھے، والد کے انتقال کے بعد چار سال بچی ہوئی آمدنی سے زندگی گزاری، اسی دوران بعض قیمتی چیزوں کو فروخت کر کے "الہلال" جاری کیا، 1912ء سے 1920ء "الہلال" اور "البلاغ" پریس معاش کا ذریعہ تھا، جب یہ پرچہ بند ہو گئے تو اس کی پریس بیچ کر جو روپیہ ملا اسی سے زندگی گزاری، 1916ء کو قانون دفاع ہند کے تحت بنگال بدر کئے گئے اور رانچی میں نظر بند کر دئے گئے، یہ آپ کی پہلی قید تھی، اس نظر بندی کے دوران آپ نے تذکرہ اور بعض دوسری کتابیں تصنیف کیں، 1920ء میں اس قید سے رہا کئے گئے، اس دوران حکومت نے نظر بندی کا الاؤنس دے رکھا تھا، اور کتابوں کی فروخت سے گزارا ہوتا تھا۔

1920ء میں رہا ہوئے تو گاندھی جی سے ملاقات ہوئی اور آپ کانگریس میں شامل ہو گئے پھر زندگی بھر کانگریس ہی میں رہے، اور ملکی سیاست کے سربرآوردہ رہنماؤں میں شامل ہو گئے۔ تحریک عدم تعاون میں دو سال قید ہوئے، اس وقت بھی آپ کا گزر بسر "البلاغ" پریس ہی کے ذریعہ یا چھوٹی موٹی کتابوں کی فروخت پر تھا، پھر پریس بیچ کر چند گائیں اور بھینس خرید کر ایک پنجابی دوست کے حوالہ کر دی اور اسی سے روزہ مرہ کے اخراجات پورے ہوتے تھے، 1930ء میں کانگریس کی نمکین ستیہ گرہ میں بحیثیت صدر گرفتار ہوئے دو سال قید ہوئی 1932ء میں رہا ہوئے، 1931ء میں ترجمان القرآن کی فروخت سے تھوڑی آمدنی ہوئی، 1936ء میں دوسری جلد کی اشاعت ہوئی، 1932 سے 1938 تک بھی مالی حال درست نہ ہوئے، آپ اپنے وقت میں امام الہند تھے مگر زندگی افلاس کی گزاری، 15 فروری 1940 کو کانگریس کی صدارت کا الیکشن ہوا اور 21 مارچ کو رام گڑھ میں کانگریس کی صدارت کا چارج لیا، آپ کا دور صدارت کانگریس کی تاریخ کا انتہائی نازک اور سب سے طویل رہا، آپ ہی کی زیر صدارت کانگریس نے آزادی وطن کی فیصلہ کن اور آخری لڑائی لڑی، آپ نے سب سے پہلے انفرادی ستیہ گرہ شروع کی جنوری 1941ء کو دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے گرفتار کر لئے گئے اور 4 دسمبر 1941ء کو رہا کر دیا گیا، آپ ہی زیر صدارت 8 اگست 1942ء کو کانگریس نے کوئٹ انڈیا (Quit India) تحریک شروع کی، جس سے قصر برمنگھم بھی لرز اٹھا، لہذا 1942ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی سمیت مولانا احمد نگر کے قلعہ میں قید کر دئے گئے، یہاں آپ 1945ء تک مقید رہے، آخر کار برطانیہ نے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا، اور 24 اگست 1946ء کو ہندوستان میں ایک عارضی حکومت وجود میں آگئی، اس طرح آپ کی چھ برس کے زیر صدارت

ہندوستان جنگ آزادی کے تمام مراحل طے کئے، آپ کے بعد پنڈت نہرو جولائی 1946ء کو کانگریس کی صدارت کا چارج لیا، اور جب عارضی حکومت بنائی گئی پنڈت نہرو نے آپ کو اپنی کابینہ میں وزیر تعلیم بنایا اور آپ آخری عمر تک اس عہدہ پر رہ کر ملک کی خدمت کرتے رہے۔

اپنی پوری زندگی میں آپ دس سال سات ماہ قید میں رہے، قید کے دوران آپ نے متعدد کتابیں لکھیں، غبار خاطر، ترجمان القرآن کے بعض مقامات وہیں لکھے، 1946ء میں "غبار خاطر" حالی پبلشنگ ہاؤس سے چھپی، غالباً دس ہزار روپیہ حاصل ہوئے، دوسرا ایڈیشن مکتبہ آزاد کے زیر اہتمام شائع ہوا، اس ایڈیشن کی رائلٹی سے پچیس ہزار روپئے ملے، اور 1947ء سے 1958ء اپنی رحلت تک ہندوستان کی مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم رہے، لیکن اپنی تنخواہ کا تین چوتھائی غریب الحال اور بے سہارا بیواؤں کو وظائف میں دیتے رہے اور باقی ایک چوتھائی میں کوٹھی کے اخراجات پورے کرتے رہے۔

8.2.5 مولانا کی وفات

11 فروری 1958ء کو آل انڈیا ریڈیو نے خبر دی کہ مولانا علیل ہو گئے ہیں، اس رات کابینہ کی میٹنگ سے لوٹے تھے تو ہشاش بشاش تھے، کسی مرض کا شائبہ نہ تھا، حسب معمول سویرے اٹھے اور غسل خانہ گئے تو یکایک فالج نے حملہ کر دیا، پنڈت جواہر لال نہرو اور رادھا کرشنن فوراً پہونچے، ڈاکٹروں کی ٹیم بھی پہونچ گئی، مولانا بے ہوشی کے عالم تھے، ڈاکٹروں نے علاج شروع کیا، لیکن صحت بہتر نہ ہو رہی تھی، 21 فروری کو حالت اور بھی خراب ہو گئی، آخر کار 22 فروری ایک بجے شب مولانا کی روح پرواز کر گئی، پنڈت نہرو خبر سنتے ہی دس منٹ میں پہنچ گئے اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، انہیں یاد آیا کہ آج ہی صبح مولانا نے انہیں خدا حافظ کہا تھا، پورا ملک سوگوار ہو گیا، تمام سرکاری عمارتوں کے پرچم سرنگوں کر دئے گئے، پورا ہندوستان غم میں ڈوب گیا، صبح چار بجے میت کو غسل دیا گیا، پھر تمام ہی وزراء اور بڑے سرکاری افسروں نے پھول چڑھائے، پنڈت نہرو کا خیال تھا کہ مولانا کے جنازہ میں بہت زیادہ لوگ نہیں آئیں گے، لیکن جب جنازہ انڈیا گیٹ اور ہارڈنگ برج سے ہوتا ہوا دریا گنج کے علاقہ میں پہنچا تو پانچ لاکھ افراد اکٹھا ہو چکے تھے، مولانا احمد سعید دہلوی صدر جمعیت علماء ہند نے دو بج کر پچاس منٹ پر نماز جنازہ پڑھائی اور لحد میں اتارا اور جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان پارک میں دفن کئے گئے۔

8.3 مولانا آزاد کی صحافتی خدمات

بچپن ہی میں مولانا ابو الکلام آزاد مختلف علوم میں مہارت حاصل کر چکے تھے اور تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے، گیارہ برس کی عمر ہی میں شعر گوئی شروع کر دی تھی، ان کی وسیع علمی شخصیت اس کی متقاضی تھی کہ وہ کسی ایسے پلیٹ فارم کا انتخاب کریں جہاں وہ آسانی کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کر سکیں، لہذا صحافت سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا، لہذا صحافت کے میدان میں مختلف حیثیتوں سے کام کیا، بعض جرائد خود آپ کی ملکیت تھے، لیکن ادارتی کاموں کی ذمہ داری دوسروں کی تھی، بعض اخبارات مولانا کی نگرانی میں نکلتے تھے، لیکن مولانا کا ان سے مالکانہ و مدیرانہ تعلق نہ تھا، بعض رسائل کے وہ نہ مالک تھے اور نہ ہی مدیر، لیکن ادارتی کاموں کی

ذمہ داری انہوں نے خود سنبھال رکھی تھی، بعض رسائل کے مولانا مدیر تھے لیکن ان کے مالک نہ تھے، بعض رسائل میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا، ان گوناگوں حیثیتوں سے کام کرنے کی وجہ سے مولانا کو اخبارات کے ہر طرح کے کاموں کا تجربہ ہو گیا تھا، اور ان چیزوں نے انہیں کامیاب صحافی بنانے میں بہت مدد کی تھی۔

نیرنگ عالم: ابتدا میں مولانا کو شاعری کا شوق تھا، یہ شوق اتنا بڑھا کہ ایک رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا، مولانا کہتے ہیں کہ ہم نے بے سرو سامانی کے عالم میں پچاس روپئے کا انتظام کیا، لیتھو کا ایک پریس "ہادی پریس" کے نام سے ہریسن روڈ کلکتہ میں تھا، والد مرحوم کی بعض چیزیں وہاں چھپا کرتی تھیں، ہم نے فورا اعلان شائع کر دیا، اور اس کا نام "نیرنگ عالم" تجویز کیا، مشہور شعراء سے نظمیں اور غزلیں منگوائی گئیں۔ اس پرچہ اشاعت کا زمانہ طے کرنا کافی مشکل ہے، کیوں کہ اس کے پرچے اب دستیاب نہیں ہیں، البتہ اندازا یہ ماہ جون 1899ء کا زمانہ ہے۔

احسن الاخبار: یہ اخبار کلکتہ کے ایک کتب فروش اور مصطفائی پریس کے مالک عبد الغفور کلکتہ سے نکالا کرتے تھے، مولانا چوں کہ کلکتہ ہی میں مقیم تھے، لہذا اکثر ان کے آفس میں جانا ہوتا تھا، اس وقت تک مولانا کو تحریر کی کافی مشق ہو چکی تھی، لہذا آپ اپنے مضامین اسی میں شائع کراتے تھے، اس اخبار کے تبادلے کے نتیجہ میں عرب ممالک کے بہت سارے مجلات آیا کرتے تھے، اس سے مولانا ابو الکلام آزاد کو عرب ممالک کی خبریں ملنا زیادہ آسان ہو گئیں، عرب صحافی اور علماء کے آراء وخیالات سے واقفیت حاصل ہوئی، خصوصی طور پر علامہ رشید رضا المصری کے رسالہ "المنار" سے کافی متاثر ہوئے، اسی کے ساتھ عربی زبان پر ان کی پکڑ بھی مضبوط ہوئی، عربی اخبارات کے مضامین، خبروں کا انتخاب، ترجمہ، رسالوں کتابوں پر ریویو، نیز اخبار وحوادث پر بحث ونظر وغیرہ مختلف قسم کے مضامین لکھنے کا موقع ملا۔

لسان الصدق: مولانا نے اس پرچہ کو شائع کرنے سے پہلے بھی متعدد اخبارات ورسائل میں کام کیا، لیکن ان سب میں یہ اپنی علمی وادبی شہرت کی بنا پر نہایت اہمیت کا حامل ہے، یہ پرچہ مولانا کی صحافتی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اپنے خیالات وافکار کے اظہار کے لئے انہوں نے "لسان الصدق" نومبر 1903ء میں جاری کیا، اس وقت آپ کی عمر پندرہ برس سے زائد نہ تھی، لیکن اسلوب کی بلندی اور مضامین کی علمیت سے اکثر پڑھنے والوں کو یہ گمان ہوتا کہ مصنف کوئی معمر بزرگ ہے، کیوں کہ اس کے مقاصد بھی انتہائی بلند تھے، جس میں اردو کا فروغ، اصلاح معاشرہ، تنقیدی مضامین کی اشاعت، لوگوں میں علمی مذاق کو پیدا کرنا، مختلف اہم کتابوں پر ریویو لکھنا شامل تھا، اس کی علمی وادبی معیار کو دیکھ کر انجمن ترقی اردو نے اسے اپنا آرگن قرار دیا، لسان الصدق تقریبا اٹھارہ مہینہ تک جاری رہ سکا، چوں کہ مولانا اکثر سفر میں رہتے تھے، جس کی وجہ سے اس پرچہ کی باضابطہ اشاعت پر کافی اثر پڑا، بعض اوقات دو مہینہ میں صرف ایک شمارہ شائع ہوا، اس طرح نو شمارے جاری ہونے کے بعد یہ پرچہ بند ہو گیا۔

الندوہ: لسان الصدق نکالنے کے دوران آپ کی علامہ شبلی نعمانی سے خط وکتابت ہونے لگی، بمبئی میں ملاقاتیں بھی رہیں، علامہ شبلی مولانا ابو الکلام آزاد کے علمی ذوق، وسعت مطالعہ اور ذہنی صلاحیت سے کافی متاثر ہوئے، علامہ شبلی "الندوہ" کی ادارت کے لئے کسی معاون کی ضرورت کو محسوس کر رہے تھے، لہذا 1905ء میں علامہ شبلی نے انہیں لکھنؤ آنے کی دعوت دی تاکہ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماہانہ

رسالے "الندوہ" کی ادارت سنبھالیں، یہ ایک خالص علمی و تحقیقی پرچہ تھا، اور ندوۃ العلماء کا ترجمان ہونے کے نتیجہ میں اس کی ادارت ایک بڑی اہم ذمہ داری تھی، لیکن ان کی علمی صلاحیت اور صحافتی تجربات کی بنیاد پر علامہ شبلی نے یہ اہم ذمہ داری ان کے سپرد کی، اس کا دائرہ علوم وفنون کی تمام ہی شاخوں تک محیط تھا، آپ نے اس میں کئی وقیع علمی مضامین لکھے، کتابوں پر علمی تبصرے شائع کئے، گرچہ مولانا اکتوبر 1905ء سے مارچ 1906ء تک اس پرچہ سے وابستہ رہے لیکن اپنے ذوق اور معیار کا اعلی نمونہ دوسروں کے لئے چھوڑ گئے۔

وکیل: لکھنو چھوڑ کر مولانا امر تسر چلے آئے، وہاں سے ایک مشہور اخبار "وکیل" نکلتا تھا، جس کے مالک شیخ غلام احمد امر تسری تھی، مولانا جب الندوہ کے ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے "وکیل" کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی، "الندوہ" سے الگ ہونے کے بعد اسی پرچہ سے وابستہ ہوگئے، اس میں آپ نے بڑی خوش گوار تبدیلیاں کیں، اس کی ظاہری اور معنوی دونوں صورتوں میں گویا ایک انقلاب آگیا، اس کی اشاعت میں باقاعدگی نہ تھی، صفحات محدود تھے، آپ نے صفحات میں اضافہ کیا، باقاعدہ شائع کرنا شروع کیا، عمدہ کاغذ پر چھپنے لگا، کتابت بھی صاف اور خوبصورت ہوگئی جس سے اس پرچہ کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا، اس زمانے میں "زمیندار" جسے مولوی ظفر علی خان نکالا کرتے تھے اپنے وقت کا معروف اخبار تھا، مگر وکیل کی اتنی شہرت ہوئی زمیندار قعر گمنامی میں چلا گیا، خود مولانا کی علمی اور ذہنی سطح بلند ہوئی، آپ کے قومی خیالات میں تبدیلی آئی، آپ پوری تندہی سے "وکیل" میں کام کرتے رہے، بعد میں کسی ناخوش گوار واقعہ کی وجہ سے آپ کو اس سہ روزہ اخبار کو الوداع کہنا پڑا۔

الہلال والبلاغ: 20 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے آپ نے کئی ایک پرچوں میں کام کیا، کچھ اخبارات خود ہی جاری کئے جب کہ بعض اخبارات اور رسائل میں کام کیا، گویا وہ اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لئے تربیت اور تجربات کے مراحل سے گزر رہے تھے، اسی دوران یہ بھی تجربہ ہوا کہ ملک میں اصلاح و بیداری، انقلابی افکار کا اظہار کے لئے کوئی تحریک اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک ایڈیٹر کا قلم مالک کی مداخلت کے خطرے سے پوری طرح مطمئن نہ ہو اور ہر طرح کی مصلحتوں سے پرے ہو، یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب کہ اخبار کی ادارت کے ساتھ ساتھ ملکیت کی زمام بھی ایک ہی ہاتھ میں ہو، گویا یہ پرچہ مولانا کی سالوں تجربوں اور محنت کا نتیجہ تھا۔

جولائی 1912ء میں ہفت روزہ اخبار "الہلال" کا اجراء اسی فکر کا نتیجہ تھا، اس کا پہلا شمارہ 13 جولائی 1912ء کو شائع ہوا، اس پرچہ میں بڑے بڑے لوگوں نے کام کیا، جن میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد اللہ عمادی، مولانا عبد السلام ندوی اور دیگر بڑی بڑی شخصیات شامل تھیں، علامہ شبلی کی کئی ایک نظمیں پہلی بار الہلال ہی میں شائع ہوئیں، چند ہی برسوں میں اس پرچہ نے عوامی مقبولیت حاصل کرلی، لہذا حکومت کو اس کی جانب سے اندیشہ ہونے لگا، بمشکل تین برس ہی چلا تھا کہ حکومت نے ان سے دو ہزار ضمانت طلب کرلی، لیکن جب یہ وار خالی گیا تو دس ہزار طلب کیا، یہ رقم مولانا کی مقدار سے کہیں زیادہ تھا، لہذا انہوں نے یہ پرچہ بند کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا پرچہ "البلاغ" جاری کیا، ان دونوں میں صرف نام کا ہی فرق تھا ورنہ صوری اور معنوی حیثیت میں کوئی بھی فرق نہ تھا، مگر یہ پرچہ بھی حکومت کی نظر بد سے محفوظ نہ رہ سکا، مارچ 1916ء میں حکومت بنگال نے ڈیفنس آف انڈیا آرڈی ننس کے تحت ان کے صوبے سے اخراج کا حکم جاری کر دیا اور بیشتر صوبے پہلے ہی اپنے یہاں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے چکے تھے، اس کے بعد مولانا رانچی منتقل ہوگئے اور رانچی میں قیام پر پانچ مہینہ بھی

نہیں گزرا تھا کہ 8 جولائی 1916ء کو حکومت ہند نے ان کی رانچی ہی میں نظر بندی کا حکم جاری کر دیا۔

الہلال اپنے عہد کا نمایاں پرچہ تھا، اس شان کا کوئی بھی ہفتہ وار پرچہ اردو میں نہیں شائع ہوا، اس کے بعد جو بھی پرچے نکلے سبھی مدیران حضرات کی یہی خواہش تھی وہ شکل وصورت اور مضامین کی ترتیب میں، اداریے اور تصاویر وغیرہ میں الہلال کی ہی پیروی کریں، اس پرچہ کی سب سے نمایاں خاصیت اس کے مدیر مولانا ابو الکلام آزاد کی تحریر تھی، مولانا نے اپنے ہم وطنوں، ارباب حکومت، اکابر قوم سبھی کو للکارا، کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا، بے خوف وخطر ہر ایک کی گرفت کی، انگریز حکومت کی آپ نے شدید تنقید کی، آپ سے پہلے پوری سیاسی تحریک نرم گفتاری سے چل رہی تھی، حکومت کی کڑی تنقید کا آغاز آپ کی تحریر سے ہوا، الہلال 1912 میں جاری ہوا اور البلاغ سمیت 1916 میں بند ہو گیا، "الہلال" مولانا کے لئے ایک نیا تجربہ تھا، آپ نے اسے بجائے لیتھو کے ٹائپ میں چھپوانا شروع کیا، گرچہ لوگ اس وقت تک اردو ٹائپ میں چھپی ہوئی چیزوں کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور لیتھو کی نستعلیق ہی کے عادی تھے، مگر الہلال کا اردو ٹائپ میں چھپنا اس کی مقبولیت میں بالکل مانع نہیں ہوا، اس میں کاغذ بھی نہایت اعلی اور سفید گلیز ڈ استعمال کیا گیا، اس میں تصاویر کا بھی خاصہ اہتمام تھا، تصویروں کے بلاک نہاعت عمدہ اور صاف ہوتے تھے، اکثر نوجوانان ترکی کی تصویریں نہایت دیدہ زیب الفاظ میں چھپتی تھی۔

الہلال اور البلاغ میں آپ نے جو مضامین لکھے اس کا ادبی معیار بھی کافی بلند تھا، مدیر مسئول و محرر خصوصی کا خصوصی فقرہ ہوا کرتا تھا، آج کل یہ فقرہ اخباروں اور رسائل میں کافی مستعمل ہے، اردو زبان میں مولانا ہی نے اسے داخل کیا۔ آپ کی تحریروں میں جوش وخروش ہوا کرتا تھا، آپ کی تحریریں پڑھنے کے بعد لوگ بے خود ہو جاتے تھے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ مولانا الفاظ کے جادو گر تھے، انہیں یہ کمال حاصل تھا کہ ایسے الفاظ وتراکیب کا استعمال کرتے تھے کہ لوگ پڑھ کر مسحور ہو جاتے تھے۔ باوجود اس کے کہ آپ کی تعلیم عربی اور فارسی میں ہوئی تھی اور آپ کو ان زبانوں پر مہارت بھی حاصل تھی، لیکن ان کی تحریر عربی وفارسی کے ثقیل الفاظ سے گرانبار نہ تھی، نہ ہی اس میں کچھ روانی اور شگفتگی میں کمی تھی، جہاں کہیں مشکل عبارت ملے گی اس کی توجیہ یہ کی وہاں ان کے مخاطب عوام نہیں بلکہ اہل علم کا طبقہ ہوتا ہے، خصوصا الہلال، اس میں بیشتر موضوعات انہیں اصحاب کی دلچسپی کے لئے تھے۔

8.4 مولانا آزاد کی تفسیری خدمات

تفسیر ترجمان القرآن: آپ کا تعلق ایک دینی خاندان سے تھا، آپ نے علم دین کی تعلیم حاصل کی اور اس میں کمال درجہ امتیاز پیدا کیا، آپ کی دینی خدمات میں سب سے نمایاں نام تفسیر "ترجمان القرآن" ہے، اس میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر دونوں ہے، آپ کا مطالعہ قرآن کافی وسیع تھا، جابجا اس کا اظہار مختلف مواقع پر ہوتا رہتا تھا، خصوصا جب آپ کلکتہ سے "الہلال" شائع کر رہے تھے تو اس میں جابجا قرآنی آیتوں سے استدلال کرتے تھے، دنیائے صحافت میں یہ ایک نیا طریقہ تھا، پھر یہ اتنا مقبول ہوا کہ قرآن کی تفسیر لکھنے کا خیال پیدا ہوا، آپ کے سامنے تین چیزیں تھیں، ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ تفسیر، 1916ء کے ابتدائی مہینوں تک ترجمہ پانچ پاروں تک ہو چکا تھا، اور تفسیر سورہ "آل عمران" تک پہونچ چکی تھی اور مقدمہ تفسیر یاداشت کی شکل میں آچکا تھا، کچھ تفسیر کے فارم چھپ چکے تھے اور ترجمہ کی کتابت

شروع ہورہی تھی کہ حکومت ہند نے 1916ء مولانا کو کلکتہ سے خارج کر دیا اور آپ رانچی پہونچ گئے، لیکن وہاں بھی حکومت نے انہیں نظر بند کر دیا، نظر بندی کے دوران تمام کاغذات خفیہ پولیس اٹھالے گئی اور اس میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر بھی موجود تھا، رہائی کے بعد 1921ء میں دوبارہ گرفتار ہوئے، آپ کے گھر کی تلاشی لی گئی، تفتیشی افسران پھر سارا علمی مسودہ اپنے ساتھ اٹھالے گئے اور طویل مدت کے بعد جب واپس ملے تو نصف سے زائد غائب ہو چکے تھے، اور بقیہ بھی صحیح سلامت نہ تھے، بلکہ اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے، لیکن مولانا بہت ہی صابر اور مستقل مزاج آدمی تھے، لہذا رہا ہونے کے بعد دوبارہ تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور ترجمان القرآن کی پہلی جلد 1932ء میں اور جلد دوم 1936ء میں بڑی تقطیع پر شائع ہوئی، ان دو جلدوں میں 18 پاروں کا ترجمہ ہے، اس میں مولانا نے سورہ فاتحہ کی تفسیر بہ طور دیباچہ کے لکھی جو 172 صفحات پر مشتمل ہے، جب مولانا کی تفسیر چھپ کر آئی تو جیسا کہ توقع تھی اسے سراہا بھی گیا، اسی کے ساتھ ایک طبقہ میں اس پر سخت تنقید اور نکتہ چینی بھی ہوئی۔

افسوس کی یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی، وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکتے تھے لیکن سیاسی سرگرمیوں نے ان کے وقت اور صلاحیت پر قبضہ کر لیا اور وہ بقیہ تفسیر مکمل نہ کر سکے، یقینا یہ ایک بڑا علمی خسارہ ہے، لیکن قرآن کے نصف اول میں بنیادی علمی گفتگو اس طرح سے کی ہے کہ اس سے بیشتر دین کے مسائل کا احاطہ ہو جاتا ہے۔

8.5 مولانا ابو الکلام آزاد کی سیاسی خدمات

ہندوستانی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جس نازک دور میں فہم و بصیرت کے ساتھ مولانا ابو الکلام آزاد نے جو سیاسی خدمات انجام دی ہیں وہ اپنے آپ میں بے مثال ہیں اور شاید ہی تاریخ اپنے آپ کو دہرائے، یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے اسے تحریک آزادی کے دوران ایسی قد آور شخصیتیں میسر آئیں جن کا مثیل ملنا دشوار ہے، مولانا آزاد نیشنلسٹ اور جمہوری نظام کے علم بردار تھے، ملک کی سیاست نے بہت سی کروٹیں لیں، بڑے سے بڑے لیڈر ادھر سے ادھر ہو گئے لیکن مولانا آزاد کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔

الہلال کے اجراء سے پہلے آپ بنگال کے انقلابیوں سے متاثر تھے، ہندوستان میں مسلح بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوتے تھے، ایک طرف بنگال کے انقلابیوں سے تعلقات استوار تھے دوسری طرف سرحد کے قبائل میں ان کے آدمی کام کر رہے تھے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا عبید اللہ سندھی سے بھی رشتہ مضبوط تھا لیکن کچھ ہی وقت گزرنے کے بعد آپ کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور آپ سمجھ گئے کہ ہتھیاروں کے زور پے انگریزوں کو نہیں نکالا جاسکتا، آپ کی سیاسی زندگی کا اصل موڑ اس وقت آیا جب آپ 1920ء میں رانچی کی نظر بندی سے رہا ہونے کے بعد پہلی دفعہ گاندھی جی سے ملے، اور گاندھی جی نے تحریک خلافت کے ساتھ اپنی عملی وابستگی کا اظہار کیا اور اسی کے ساتھ عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا، جس نے ایک طرف ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں ہلا دیں اور دوسری طرف ہندو مسلم اتحاد کی روح پرور مناظر سامنے آئے، 1920ء سے 1930ء تک کانگریس نے آزادی کے لئے جتنی بھی تحریکیں چلائیں ان میں ایک ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں نے بڑھ چڑھ حصہ لیا، یہ سب مولانا آزاد کی کوششوں کا نتیجہ تھا، چنانچہ کانگریس نے جب 1930ء میں نمک ستیہ گرہ

شروع کیا اور گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کیا تو تقریبا چار ماہ کے اندر جیل بھر گئے، ستر ہزار کے لگ بھگ سیاسی قیدی بنائے گئے جن میں چوبیس ہزار کے قریب مسلمان تھے۔

مولانا ابو الکلام آزاد کے سیاسی میدان میں داخل ہونے سے پہلے ہندوستانی تحریک آزادی انگریزوں کے سامنے کچھ لو کچھ دو انداز میں کام کر رہی تھی، لیکن آپ نے بنا کسی سودے کے مکمل آزادی کی بات کی، گاندھی جی کے ساتھ مل کر ابو الکلام آزاد نے تحریک آزادی کو صحیح معنوں میں ایک قومی تحریک بنایا، آپ نے ہندو اور مسلم دونوں کو اس تحریک سے جوڑا، آپ صحیح معنوں میں ہندو مسلم اتحاد کے علمبر دار تھے، آپ کا کہنا تھا کہ "اگر بادلوں سے اتر کر ایک فرشتہ قطب مینار کی چوٹی پر چڑھ جائے اور یہ اعلان کرے کہ ہندوستان کو آزادی آج ہی مل سکتی ہے بشر طیکہ ہندو مسلم اتحاد سے دستبر دار ہو جاؤ، لیکن میں ہندو مسلم اتحاد کو نہیں چھوڑوں گا کیوں ہمیں آزادی نہ ملی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہو گا لیکن اگر ہندو مسلم اتحاد قائم نہ رہ سکا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہو گا"۔ آپ مذہبی، سماجی اور سیاسی ہر طرح کے اتحاد و یگانگت کے داعی تھے، آپ نے ملک کے علاقائی بنیادوں پر ہونے والے اختلاف کے خلاف بھی آواز اٹھائی، آپ کے دور میں بعض صوبوں کے لوگ صوبائی عصبیتوں کے قائل ہو رہے تھے، خصوصا بنگال کے لوگ "مائی بنگال" کے نعرے لگ رہے تھے، آپ نے کہا کہ یہ چیز انڈین نیشنلٹی کے لئے سخت مضر ہے، اور اس کے لئے آواز بلند کی اور لوگوں کو متحدہ ہندوستان کے شہری بننے کی دعوت دی۔

آپ کو کانگریس کے سب سے کم عمر صدر ہونے کا بھی اعزاز حاصل رہا، آپ نے پہلی دفعہ 15 دسمبر 1923ء کی دہلی کے خصوصی اجلاس کی صدارت کی، یہ اجلاس کانگریس کی لیڈر شپ کے دو گروہوں کو جوڑنے کے لئے تھا، ایک گروہ نسلوں کے حق میں اور دوسرا اس کے خلاف تھا، مولانا نے انہیں اکٹھا کیا اور اختلاف کے بجائے تعاون کا راستہ پیدا کیا، یہ کوئی معمولی چیز نہ تھی، مولانا نے کانگریس کو انتشار سے بچایا اور دونوں گروہوں کے نقطہ نظر میں ہم آہنگی پیدا کر کے باہمی تصادم کو ختم کیا۔

1942ء سے 1945ء تک مولانا ابو الکلام آزاد نظر بند رہے، 1945ء میں ان کی رہائی کے بعد برطانوی حکومت سے حصول آزادی کے لئے مذاکرات ہوئے اور اسی دور میں انتقال اختیارات کا بھی فیصلہ ہوا، یہ سب آپ ہی کے دور صدارت 1940ء تا 1946ء کے درمیان ہوا، یہ آپ کے سیاسی تدبر کا سب سے بڑا امتحان تھا، جس میں آپ کامیاب و کامران ہو کر نکلے، تقسیم ہند کے بعد قومی رہنماؤں نے ملک کا جو دستور بنایا اس کی بنیاد سیکولر ازم پر رکھی، اس میں ہر میدان میں مساوی حقوق دئے گئے، یہ ایک بڑا کارنامہ تھا، اس کا کریڈٹ گاندھی، نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد کو برابر جاتا ہے، دستور سازی کے تمام مرحلے میں مولانا عملی طور پر اس سے وابستہ رہے اور جہاں تک ممکن ہوا بدلے ہوئے حالات کے باوجود دستور ساز اسمبلی کو صحیح راستے سے ہٹنے نہیں دیا۔

تقسیم وطن نے ملک میں جو بہت سارے مسائل پیدا کر دئے تھے اس میں سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کے اپنے وجود کو قائم رکھنے کا تھا، مسلم لیڈروں کی ایک بڑی جماعت پاکستان جا چکی تھی، ملک میں فسادات کا دور چل رہا تھا، اس وقت مسلمانوں کی ہمت بندھانے اور ان کی رہنمائی کرنے لئے جو شخصیت میدان میں موجود تھی وہ مولانا ابو الکلام آزاد کی تھی، دلی کی جامع مسجد سے مسلمانوں کو جھنجھوڑا، لکھنو کے پلیٹ فارم سے مولانا آزاد نے مسلمانوں سے کہا فرقہ وارانہ بنیادوں پر جماعت سازی کا تجربہ تم کر چکے ہو اور اس کے نتائج بھی دیکھ چکے، اب

ملک کی مشترکہ سیاسی جماعتوں میں شریک ہو کر کام کرنے کا تجربہ کرو۔

8.6 فرہنگ

حریت پسند : آزادی چاہنے والا

بہانگ دہل : بآواز بلند

نستعلیق : ایک اہم اور مشہور ترین طرز تحریر

دیدہ زیب : دیکھنے کے لائق

افتادِ طبع : مزاج، طبیعت، فطرت، جبلت، رجحان، ذہنی جھکاؤ

8.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- مولانا ابوالکلام آزاد ایک حریت پسند آدمی تھے، اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں کبھی بھی آزادی سے سودا نہیں کیا، ہمیشہ وہی کام کئے جو انہیں پسند تھے، وہ کام جس میں آپ کا میلان نہیں تھا اس میں چاہے جتنے ہی فائدے ہوں آپ کبھی اس کی طرف نہیں گئے، لہذا والد محترم نے جب آپ کو اپنا جانشین بنانا چاہا، اور یہ خواہش کی کہ وہ بھی پیری مریدی کے راستے پر آجائیں، اور آرام سے اپنی زندگی گزاریں، لیکن آپ نے اس آسان راستے کو چھوڑ کر صحافت جیسا دشوار گزار راستے کا انتخاب کیا، کیوں یہ راستہ آپ کے دل کے قریب تھا۔
- آپ نے ہمیشہ حق کو بہانگ دہل کہا، مخالفتوں کے طوفان آئے اور بڑے بڑے صاحبان عزیمت تنکوں کی طرح بہہ گئے، عوام کے سیلاب کے آگے بڑے بڑے لوگوں کا وقار خاک میں مل گیا، لیکن کوئی بھی آندھی آپ کے پائے استقلال کو جنبش نہ دے سکی، آپ جس مقام پر کھڑے تھے ہمیشہ کھڑے رہے، اپنی فہم و فراست، نظر و بصیرت اور وسیع مطالع کے نتیجہ میں زندگی کا جو رخ متعین کر لیا تھا زندگی بھر اسی راہ پر چلے۔
- صحافت مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا بڑا میدان ہے، اس میدان میں ان کی بہترین ذہنی و فکری صلاحیتوں کا اظہار ہوا، مولانا کے فکر و نظر کی گہرائی، مطالعہ کی وسعت اور آپ کی دلچسپی کا اندازہ صحافت ہی سے ہوتا ہے، ان کی صحافت کا ایک ایک صفحہ آپ کی علمی، ادبی، مذہبی اور فکری کمالات کی داستان بیان کرتا ہے، اس سے مولانا کے تبحر علمی اور ذوق و نظر کے نئے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔
- آپ کا نصب العین ہمیشہ بلند رہا، ہمیشہ ملک و قوم کی بہتری کے لئے سرگرم رہے، صحافت کے میدان میں بھی اسی وجہ سے داخل ہوئے کہ ملک و قوم کے مسائل کو عام لوگوں تک پہونچایا جائے، آپ کے اندر ایک پاکیزہ جمالیاتی ذوق تھا، آپ کے فضل و کمال اور

علمی وفنی صلاحیتوں میں بڑا تنوع تھا، گویا مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ ان سے بہت کم تھیں جو چھپی رہ گئیں۔

8.8 نمونہ امتحانی سوالات

8.8.1 معروضی جوابات کے متقاضی سوالات

1. مولانا ابوالکلام آزاد کا اصل نام کیا تھا؟

(a). محمد احمد (b). محی الدین (c). شریف الدین (d). محمد اسد

2. ابوالکلام آزاد کی پیدائش کس جگہ ہوئی؟

(a). مکہ (b). مدینہ (c). دہلی (d). کلکتہ

3. 1903ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کس پرچہ کا اجرا کیا؟

(a). الہلال (b). البلاغ (c). ماہنامہ بجنور (d). لسان الصدق

4. "الندوہ" کس ادارہ کا ترجمان رسالہ تھا؟

(a). دہلی کالج (b). دار العلوم دیوبند (c). مدرسہ رحیمیہ (d). دار العلوم ندوۃ العلماء

5. البلاغ پرچہ کب بند ہوا؟

(a). 1916ء (b). 1915ء (c). 1917ء (d). 1918ء

6. مولانا ابوالکلام آزاد کے والد کا کیا نام تھا؟

(a). خیر الدین (b). شیخ جمال الدین (c). محمد نظام الدین (d). محمد رئیس

7. مولانا ابوالکلام آزاد سب سے پہلے کب قید کیا گیا؟

(a). 1912ء (b). 1916ء (c). 1918ء (d). 1920ء

8. ہفت روزہ الہلال کا اجرا کب ہوا؟

(a). جولائی 1912ء (b). اگست 1920 (c). اگست 1913 (d). ستمبر 1921ء

9. آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت میں آپ کس وزارت پر فائز ہوئے۔

(a). وزات خارجہ (b). وزارت خزانہ (c). وزارت داخلہ (d). وزارت تعلیم

10. وکیل اخبار کس جگہ سے نکلتا تھا؟

(a). دہلی (b). امرتسر (c). لاہور (d). لکھنو

8.8.2 مختصر جوابات کے متقاضی سوالات

1. لسان الصدق پرچہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں تحریر کیجیے۔
2. الندوہ پرچہ کے سلسلے میں مختصر تحریر کیجیے۔
3. الہلال اور البلاغ پر مختصر مضمون قلم بند کیجیے۔
4. مولانا آزاد کی سرگرم سیاسی زندگی بیان کیجیے۔
5. مولانا کے اخلاقی احوال پر مختصر روشنی ڈالیے۔

8.8.3 طویل جوابات کے متقاضی سوالات

1. مولانا آزاد کی حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. مولانا آزاد کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
3. مولانا آزاد کی ادبی زندگی پر مقالہ تحریر کیجیے۔

8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری
2. ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری
3. ابوالکلام آزاد : شورش کاشمیری
4. ابوالکلام آزاد : جگن ناتھ آزاد

معروضی سوالات کے جوابات

1. B	2. A	3. D	4.D	5.A
6. A	7. B	8. A	9. D	10. B

بی۔اے، اسلامک اسٹڈیز

تیسرا سمسٹر

تیسرا پرچہ (ہندوستانی مسلم مفکرین)

جملہ نمبرات:35 **وقت:2 گھنٹے**

ہدایات:

i. حصہ اول میں 05 لازمی سوال ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ کو پر کرنا / مختصر جوابات والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے ایک نمبر مختص ہے۔

i. شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان میں سے کس حدیث کی کتاب کی شرح لکھیں؟

(a). مشکوۃ المصابیح (b). موطا امام مالک (c). ترمذی شریف (d). ریاض الصالحین

ii. برصغیر میں حدیث کے تعلق سے اکثر روایات کو قائم کرنے کا سہرا کس کے سر جاتا ہے؟

(a). شیخ عبدالحق محدث دہلوی (b). علامہ شبلی نعمانی (c). علامہ اقبال (d). اشرف علی تھانوی

iii. تحریک شہیدین کا سب سے اہم معرکہ کون سا تھا؟

(a). بالاکوٹ (b). بکسر (c). پلاسی (d) سب صحیح

iv. آثار الصنادید کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a). سر سید احمد خاں (b). مدن موہن مالویہ (c). قاسم نانوتوی (d). سید علی مونگیری

v. آزاد ہندستان کی پہلی حکومت میں آپ کس وزارت پر فائز ہوئے۔

(a). وزات خارجہ (b). وزارت خزانہ (c). وزارت داخلہ (d). وزارت تعلیم

(ب) حصہ دوم آٹھ سوالات پر مشتمل ہے اور پانچ سوالات کے جوابات دینے ہیں ہر سوال کا جواب تقریباً سو لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 4 نمبر مختص ہیں۔

2. شاہ ولی اللہ کے سماجی نظریات کی وضاحت کیجیے۔
3. اشعۃ اللمعات پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
4. سید احمد رائے بریلوی کی شخصیت کا مختصر تعارف کروایئے۔
5. اسباب بغاوت ہند لکھنے کی وجوہات بیان کیجیے۔
6. قیام علی گڑھ میں مولانا پر کالج کے اثرات قلم بند کریں۔

7. اقبال کے نظریۂ تعلیم پر مختصر نوٹ لکھیے۔
8. مولانا اشرف علی تھانوی کی زندگی پر ایک نوٹ لکھیے۔
9. مولانا آزاد کی سرگرم سیاسی زندگی بیان کیجیے۔

(ج) حصہ سوم میں دو سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی ایک سوال کا جواب دینا ہیں۔ سوال کا جواب تقریباً 250 لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ سوال کے لیے 10 نمبر مختص ہیں۔

10. مولانا شبلی کا نظریہ تعلیم کیا تھا وہ کیوں روایت اور جدیدیت کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے؟ قلمبند کیجیے۔
11. سرسید کے علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد ان کی کوششوں پر مضمون لکھیے۔

اہم نکات